تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کینیڈا کا ترجمان

جنوری تا مارچ 2025ء

المنار

Taleem-Ul-Islam College Old Students Association - Canada

فہرست مضامین

قرآن، حدیث	3
ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام	3
حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی دعا کی تحریک	3
اداریہ	4
خصوصی پیغام محترم امیر صاحب کینیڈا	7
آئینہ کیوں نہ لاکے ترے رُوبرو کروں! از ناصر احمد وینس	8
تعلیم الاسلام کالج، منٹس آف میٹنگ اور سالانہ رپورٹ از عبدالحمید حمیدی	14
تعلیم الاسلام کالج کے دو پرانے اساتذہ کرام کی تقریب میں رونق افزائی	22
تعلیم الاسلام کالج۔۔۔۔ چند حقائق	24
تعلیم الاسلام کالج میری درسگاہ از بشارت حیٔ	30
حضرت حافظ مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ۔ ایک شفیق اور ڈسپلن کے پابند استاد	32
کیا تُو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟	36
پنجاب کا نقش جمال از عرفان احمد خان۔ جرمنی	39
کولیسٹرول	42
میرا سفر فلسطین از منیر الدین عبید اللہ	44
مولانا مبارک احمد نذیر صاحب کا ذکرِ خیر از منیر الحق شاہد	46
باتیں حضرت قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم کی از چوہدری نصیر احمد	48
اب ڈھونڈا نہیں چراغ رخ زیبا لے کر از ڈاکٹر عمران احمد خان	53
وطن نوردی از ہشام قمر ملک	56
ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک مختصر خطاب نوجوانوں کے لئے پیغام	61

زیرِ نگرانی:
صدر تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن۔ کینیڈا
عبدالحمید حمیدی

ایڈیٹر اردو سیکشن:
ناصر احمد وینس

ایڈیٹر انگریزی سیکشن:
عبدالحمید عبدالرحمن

ڈیزائننگ و کمپوزنگ:
شفیق اللہ

مضامین بھجوانے، نیز ادارہ سے جملہ خط و کتابت کیلئے

ای۔ میل ایڈریس:

alminaarurdu@gmail.com

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (سورۃ الانعام 11۔6)

اور یقیناً رسولوں سے تجھ سے پہلے بھی تمسخر کیا گیا۔ پس ان کو جنہوں نے ان (رسولوں) سے تمسخر کیا انہی باتوں نے گھیر لیا جن سے وہ تمسخر کیا کرتے تھے۔ (سورۃ الانعام 11۔6)

جبریل نے خوشخبری دی

آنحضرت علی نے فرمایا کہ جبریل نے مجھے خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جس شخص نے تجھ پر درود بھیجا میں اس پر رحمت نازل کروں گا اور جو تجھ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلامتی نازل کروں گا۔

(مسند احمد حدیث نمبر: 15767)

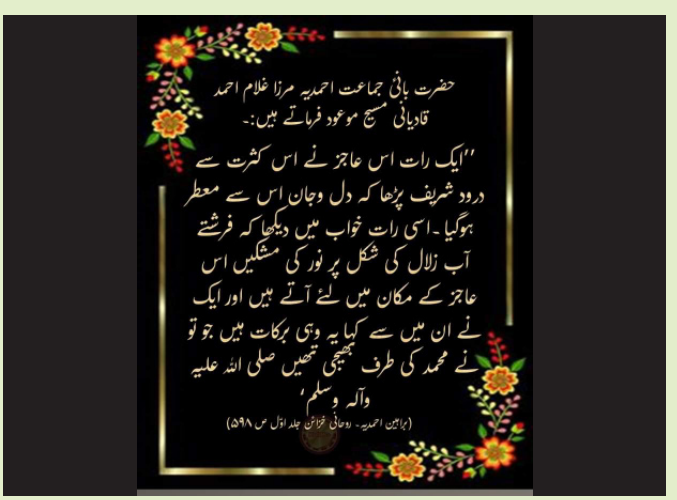

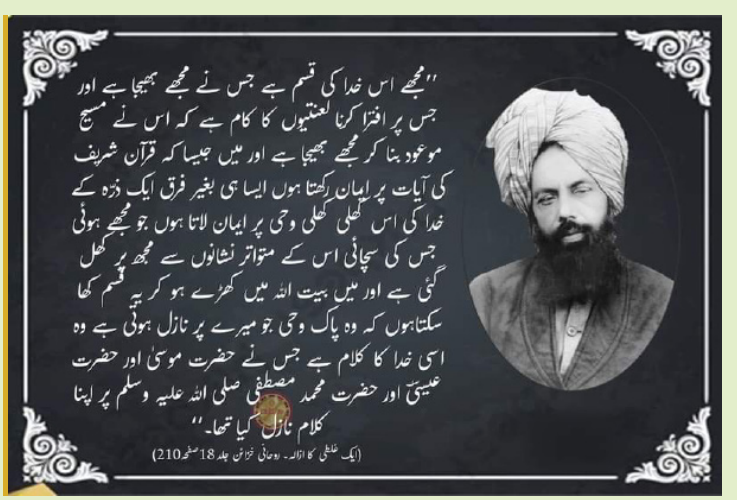

اللہ سے ڈرنے کی دعاؤں کی گھڑی ہے یہ دنیا تباہی کے دھانے پہ کھڑی ہے

''...میری دعا ہے کہ عالمی رہنما وقت کی ضرورت پر توجہ دیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کے امن اور استحکام کو یقینی بنانے کے لیے ان کی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام بے گناہ اور بے دفاع لوگوں کی حفاظت فرمائے اور دنیا میں حقیقی اور پائیدار امن قائم فرمائے۔ آمین۔''

وقتِ دعا ھے یہ

اداریہ

ایڈیٹر

احمدیہ انٹر کالجیئٹ ایسوسی ایشن اور ٹی آئی کالج سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے قیام کا تاریخی پس منظر

آج ''ٹکوسا'' (ٹی آئی کالج سٹوڈینٹس ایسوسی ایشن) اگرچہ متعدد ممالک میں بڑی مستعدی کیساتھ مصروف عمل ہے۔ تاہم سبھی اولڈ احمدی طلباء کی دینی وعلمی اصلاح کیلئے تنظیم کے اجراء کی جڑیں کیسے اور کب نمودار نمودار ہوئیں!؟ دلچسپئی طبع کی خاطر ذیل میں تنظیم کے قیام کا مختصر پس منظر پیش خدمت ہے۔

اس تنظیم کا قیام، سب سے پہلے 26 دسمبر 1944ء کو عمل میں آیا تھا۔ جلسہ سالانہ قادیان کے پہلے روز « دی پنجاب احمدیہ انٹر کالجیئٹ ایسوسی ایشن « کے نام سے اس تنظیم کا آغاز کیا گیا۔ اور یہ طے پایا کہ اس کا صدر دفتر لاہور میں ہوگا۔

اس تنظیم کو اپنے قیام کے دو ماہ بعد ہی ایک اہم تقریب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ 25/ فروری 1946ء کو حضرت فضل عمر رض نے لاہور میں اس تنظیم کے زیر اہتمام ایک زبردست اور پرمغز لیکچر دیا۔ یہ لیکچر جو بعد میں

''اسلام کا اقتصادی نظام''

کے نام سے طبع ہوا، کمیونزم کے خلاف ایک زبردست علمی مقالہ ثابت ہوا۔ اس تقریب کی صدارت معروف ہندو دانشور مسٹر رام چند نے کی۔ تقریب کے اختتام پر ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

''میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسی تقریر سننے کا موقع ملا ہے اور مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ تحریک احمدیت ترقی کر رہی ہے اور نمایاں ترقی کر رہی ہے۔ جو تقریر اس وقت آپ لوگوں نے سنی ہے اسکے اندر نہایت قیمتی اور نئی نئی باتیں حضور نے بیان فرمائی ہیں۔ مجھے اس تقریر سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے بھی ان قیمتی معلومات سے بہت فائدہ اٹھایا ہوگا۔

مجھے اس بات سے بھی بہت خوشی ہوئی ہے کہ اس جلسہ میں نہ صرف مسلمان بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی شامل ہوئے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے بہت سے معزز دوستوں سے مجھے تبادلہ خیالات کا موقع رہتا ہے۔ یہ جماعت اسلام کی وہ تفسیر کرتی ہے جو اس ملک کیلئے نہایت مفید ہے۔

پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ اور یہ میری غلطی تھی کہ اسلام صرف اپنے قوانین میں مسلمانوں کا ہی خیال رکھتا ہے، غیر مسلموں کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔

مگر آج حضرت امام جماعت احمدیہ کی تقریر سے معلوم ہوا کہ اسلام تمام انسانوں میں مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہے۔ میں غیر مسلم دوستوں سے کہوں گا کہ اس قسم کے سلام کی عزت اور حترام کرنے میں آپ لوگوں کا کیا عذر ہے؟

آپ لوگوں نے جس سنجیدگی اور سکون سے اڑھائی گھنٹے حضور کی تقریر سنی ہے اگر کوئی یورپین اس بات کو دیکھتا تو حیران ہوتا کہ ہندوستان نے اتنی ترقی کر لی ہے۔۔۔!؟

جہاں میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں (اس بات پر) کہ آپ لوگوں نے سکون کیساتھ تقریر کو سنا، وہاں میں اپنی طرف سے اور آپ سب لوگوں کی طرف سے حضرت امام جماعت احمدیہ کا بار بار لاکھ لاکھ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نہایت ہی قیمتی معلومات سے پر تقریر سے ہمیں مستفید فرمایا۔

(تاریخ احمدیت جلد 10 صفحہ 496 - 495 مطبوعہ قادیان 2007ء)

حضور رح کی اس تقریر کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسکے چند

دن بعد تنظیم کے زیر اہتمام 2/مارچ 1946ء کو 5 بجے شام چائے کی ایک دعوت دی گئی۔جس میں حضرت فضل عمر رض نے بھی شرکت فرمائی۔ اس تقریب میں مختلف کالجوں کے غیر احمدی طلباء اور پروفیسر صاحبان نے بھی شرکت کی۔ تین گھنٹے تک حضور نور اللہ مرقدہ حالات حاضرہ اور جماعت احمدیہ کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے۔

18/دسمبر 1948ء کو لاہور میں احمدیہ انٹر کالجیئٹ ایسوسی ایشن کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں محترم صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب (رح) کو صدر منتخب کیا گیا۔

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کے دور صدارت میں احمدیہ انٹر کالجیئٹ ایسوسی ایشن بڑی فعال رہی۔ اور اس کا ایک خاص علمی تشخص قائم ہوا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب رض کی ایک خاص تقریر «قیام امن» کے موضوع پر کروائی گئی (بحوالہ الفضل 9/مارچ 1948ء)

اکتوبر/1951ء میں احمدیہ کالجیئٹ ایسوسی ایشن کے کام کو تیز کرنے کیلئے محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب (سابق پرنسپل ٹی آئی کالج، ربوہ) کی نگرانی میں ایسوسی ایشن کا دستور اساسی اور لائحہ عمل تجویز کیا گیا۔ممبرشپ کے فارم چھپوائے گئے۔ اور پروفیسر صوفی بشارت الرحمان صاحب کو تعلیم الاسلام کالج لاہور کی تنظیم کا کام سونپا گیا۔

اس وقت ایسوسی ایشن کو جو لائحہ عمل دیا گیا اس کے مطابق اس تنظیم کا کام طلباء میں دینی روح پیدا کرنا۔ دعوت الی اللہ- ٹریکٹ شائع کرنا۔علمی اجلاسات منعقد کرنا وغیرہ شامل تھا۔ اس وقت ایسوسی ایشن کا سالانہ چندہ 3 روپے مقرر کیا گیا۔ عہدیداران میں نگران اعلی، نائب صدر، سیکرٹری، فنانشل سیکرٹری اور خزانچی شامل تھے۔ چنانچہ اس کے تحت 20/نومبر 1951ء کو محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب نے وائی ایم سی اے ہال لاہور میں پنجاب کے تعلیمی مسائل کے بارے میں خطاب کیا۔ اسکے بعد کے اوقات میں احمدیہ کالجیئٹ ایسوسی ایشن مختلف سطحوں پر کام کرتی رہی۔

دور نو

احمدیہ انٹر کالجئٹ ایسوسی ایشن کی تاریخ کا زریں اور روشن باب اس وقت شروع ہوتا ہے جب 1970ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں حضرت خلیفتہ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالی نے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب رح کو اسی ایسوسی ایشن کا نگران مقرر فرمایا۔حضرت صاحبزادہ صاحب موصوف کی زیر ہدایت لاہور میں پنجاب یونیورسٹی اور دیگر کالجوں میں اس تنظیم کو ایک حیات نو مل گئی۔ اس تنظیم کا نیا دستور اساسی بنایا گیا۔ لائحہ عمل طے کیا گیا۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور ملک کے دیگر تعلیمی اداروں میں اس کے ذیلی یونٹ بنائے گئے۔ جہاں علیحدہ تنظیمیں بھی قائم کی گئیں۔

تنظیم میں دستور اساسی کے تحت اس کا نام بدل کر

”احمدیہ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن“

قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حالات کے بدلنے کیساتھ تعلیمی اداروں کی اقسام میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ یونیورسٹیاں، انسٹی ٹیوٹ، کالج وغیرہ کئی اقسام کے تعلیمی ادارے وجود میں آ چکے تھے۔ لہذا نئے نام پر سب نے اتفاق کیا۔ اس دور میں (یعنی 1970ء کی دھائی میں) جلسہ سالانہ کے موقع پر طلباء کے کوائف اکٹھے کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا گیا۔ جو کئی سال تک جاری رہا۔

احمدیہ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس سے وابستہ ہونیوالے طلباء میں سے اکثر نے بعد ازاں عملی زندگی میں جماعتی خدمت میں بھی نمایاں کام کیا۔ اور جہاں جہاں بھی رہے اہم جماعتی خدمات بجالاتے رہے اور بجالا رہے ہیں۔ اس طرح سے احمدیہ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے طالب علموں کی جس کھیپ کو تربیت دی، وہ خدا تعالی کے فضل و کرم سے بہت کامیاب رہی۔ اور خدمت دین کے عملی میدان میں ان نوجوانوں نے نہایت اہم کام سرانجام دیئے۔ الحمد للہ

1984ء میں جنرل ضیاء کے جماعت احمدیہ کے خلاف فسطائی ہتھکنڈوں کے بعد لاتعداد پرانے طلباء، بالخصوص ٹی آئی کالج سے تعلیم یافتہ طلباء کی ایک بھاری اکثریت بیرون پاکستان منتقل ہوگئی۔ چنانچہ انہی پرانے طلباء کی تنظیم «ٹکوسا» مختلف ممالک میں کام کر رہی ہے۔

کینیڈا میں بھی ایک نئے ولولے کیساتھ ٹکوسا کی تنظیم نو کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں تمام ممبران کو مسی ساگا کی بیت الحمد میں ایک دعوت پر مدعو کیا گیا تھا۔ تا کہ سب دوستوں کی آپس میں فرداً فرداً ملاقات بھی ہوجائے۔ نیز آئندہ بہتر سے بہتر تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تجاویز بھی سامنے آسکیں۔

اظہار تشکر و اہل قلم احباب سے ایک درخواست

اس مجلہ کے (بذریعہ انٹرنیٹ) اجراء پر رب العزت کی بارگاہ میں صمیم قلب کیساتھ دعا کہ وہ اس مجلہ کو ہر خاص و عام کیلئے مفید، دلچسپ اور ارفع مقاصد کے حصول کا پیش خیمہ ثابت فرمائے۔ آمین

اس مجلہ کی تیاری کے سلسلہ میں سب سے پہلے تو ادارہ المنار، امیر صاحب کینیڈا محترم ملک لال خان صاحب کا ازحد مشکور ہے کہ انہوں نے کمال مہربانی سے اپنے پیغام تہنیت سے نوازا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام دوستوں کا بھی بہت ممنون ہے جنہوں نے ادارہ کی درخواست پر اپنے رشحات قلم، بہت تھوڑے وقت میں لکھ کر بھجوائے۔ اب جبکہ کینیڈا میں بھی طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج کی تنظیم ہذا ''ٹکوسا'' کو منظم کیا مجلہ ہذا بھی آپ سب کی قلمی معاونت کا منتظر ہے۔ اس کیلئے ضروی نہیں کہ آپ بہت منجھے ہوئے ادیب و شاعر ہی ہوں۔ آپ اپنی سابقہ زندگی بالخصوص زمانہ طالب علمی کے دوران پیش آنے والے واقعات، جو دوسروں کی دلچسپی کے حامل ہوں، بیشک سادہ الفاظ میں لکھ کر ادارہ کو بھجوا دیجئے۔ اس کی نوک پلک ادارہ از خود درست کر لے گا۔

امید کے قارئین کرام اس اولین کاوش پر اپنی اپنی آراء سے بھی آگاہ فرمائیں گے۔ آپ سب کے قابل قدر و قابل تقلید تعاون و قلمی معاونت پر صمیم قلب کیساتھ آپ سب کا ازحد شکریہ

ادارہ المنار، کینیڈا

ادارہ ہذا کیطرف سے مکرم شفیق اللہ صاحب کیلئے بھی دعا کی درخواست ہے جنہوں نے بڑی ہی محنت شاقہ و دیدہ زیب طریق سے پرچہ سیٹ اپ کرنیکا فریضہ انجام دیا ہے۔ جزاء کم اللہ تعالیٰ

23 مارچ ''یوم مسیح موعودؑ''

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ

''خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں کیا یورپ اور کیا ایشیا۔ ان سب کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے۔ یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جس کے لئے مَیں دنیا میں بھیجا گیا سو تم اس مقصد کی پیروی کرو۔ مگر نرمی اور اخلاق اور دعاؤں پر زور دینے سے۔''

(رسالہ الوصیت، روحانی خزائن، جلد 20، صفحہ 306 تا 307)

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی، مسیح موعود و مہدی معہودؑ

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کینیڈا کس طریقے سے مستحق طلباء کو تعلیم جاری رکھنے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ سالانہ ممبرشپ چندہ ۳۰ ڈالر ادا کرنے ساتھ ساتھ، طالبعلموں کے لئے نئی کتابیں، یونیفارم، سکولوں کے لئے کمپیوٹر اور جنریٹر وغیرہ کو مہیا کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ گزشتہ سال دسمبر میں جنرل باڈی میٹنگ کے موقع پر ہم نے ابتدائی طور پر دس ہزار ڈالر پیارے آقا کی خدمت میں ارسال کرنے کا پلان بنایا تھا۔ دوستوں کے تعاون سے اس پر عمل تو ہو رہا مگر ابھی اس میں وہ تیزی نہیں آئی۔ سارے مہران سے تعاون کی درخواست ہے۔ اول تو سالانہ مہرشپ جلد از جلد ادا فرمائیں۔ اور اس کے ساتھ اس تحریک میں بھی شمولیت اختیار فرمائیں۔ جرمنی اور یو کے کی تنظیمیں ہم سے بہت آگے ہیں اور قربانی کے ریکارڈ قائم کر رہی ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ سب کے اموال میں برکت عطا فرمائے اور مقبول قربانی کی توفیق عطا فرمائے آمین

خاکسار عبدالحمید حمیدی۔ پریزیڈنٹ ٹکوسا کینیڈا۔

خصوصی پیغام محترم امیر صاحب

جماعت احمدیہ کینیڈا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے یہ جان کر ازحد مسرت محسوس ہوئی کہ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (TICOSA) کینیڈا، ٹی آئی کالج کے ترجمان مجلہ ''المنار'' کی کینیڈا سے بھی باقاعدہ اشاعت کا آغاز کر رہی ہے۔ الحمد للہ۔

اللہ تعالیٰ اس نیک ارادہ کو احسن رنگ میں عملی جامہ پہنانے اور پھر عزم و استقلال کیساتھ اس کو جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین

تعلیم الاسلام کالج کا نام لبوں پر آتے ہی، دل اس احسان عظیم کی وجہ سے، جو اس عظیم درسگاہ نے ہم ہزاروں طلباء پر کیا، جذبات ممنونیت سے بھر جاتا ہے۔ پھر احسان کے بدلہ کا معاملہ آیا تو قرآن کریم کے الفاظ میں بھلا ''احسان'' کے سوا بھی کچھ ہوسکتا!

ہم طلبا نے قدیم، تعلیم الاسلام کالج کی مامتا جیسی عظیم درسگاہ کا بدلہ احسان سے کیسے چکا سکتے ہیں، اس بارہ میں ہم سب کو غور و فکر کر کے ایک لائحہ عمل طے کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں جرمنی اور انگلینڈ کی ٹکوسا تنظیموں نے جو قابل قدر و قابل تقلید خدمات سرانجام دی ہیں، ان کی جملہ رپورٹس کو سامنے رکھتے ہوئے اور پھر فاستبقو الخیرات کے قرآنی احکامات کی روشنی میں کینیڈا کی ٹکوسا تنظیم کو بھی اپنا لائحہ عمل بنا کر اس پر عملدرآمد کرنا چاہیئے۔

مجھے قوی امید کہ ہے ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ، جلد از جلد جملہ اراکین سے مشورہ کر کے بالخصوص جرمنی اور انگلینڈ کی تنظیموں کی عمدہ کارکردگی کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے، ایک پرعزم اور قابل عمل لائحہ عمل تشکیل دے لے گی۔ اور یوں بہت جلد ہم بھی کینیڈا کی ٹکوسا تنظیم کو ایک فعال، موثر اور مثالی تنظیم میں ڈھال کر، اس پر فی الفور کام شروع کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز

والسلام

خاکسار

ملک لال خان

خادم جماعت احمدیہ کینیڈا

آئینہ کیوں نہ لاکے ترے روبرو کروں!

تحریر: ناصر احمد وینس

پاکستان میں حال ہی میں احمدیہ مسجد ڈسکہ، جسے پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ و قائد اعظم کے معتمد ترین ساتھی حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان نے اپنے اسی آبائی قصبہ ڈسکہ میں تقریباً 8 دھائیاں قبل تعمیر کروایا تھا - ڈسکہ کی شہری انتظامیہ "اوپر" کے سرکاری آرڈرز نیز تحریک قیام پاکستان کے اشد ترین مخالف ملاوں مطالبے پر مسجد پر بلڈوزر چلا کر اسے مکمل طور پر شہید کر دیا۔۔۔!

انا للہ وانا الیہ راجعون

جب ہوس اقتدار میں مبتلاء موجودہ انتظامیہ، چوھدری صاحب کے تعمیر کردہ خدائے واحد کی عبادت بجالانے والے اس پاکیزہ گھر کو زمیں بوس کر رہی تھی تو چشم تصور میں دور ماضی کے وہ لمحات کسی فلم کی مانند ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے سے گزرتے محسوس ہوئے۔ جب:

ہندوستان کی انتظامیہ کی پش پناہی میں تاریخی بابری مسجد کو شہید کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر کی وہ مسجد بھی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔جس کی ظالمانہ بندش کو پاکستانی اخبارات مثلاً "جنگ" نے بھی اپنے صفحات پر بطور خاص چھاپا تھا۔

لیکن پاکستان کی حالیہ تاریخ میں جس طرح احمدیہ مساجد کو توڑا پھوڑا گیا، اس کی پاکستان کی گذشتہ 75 سالہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی - ڈسکہ کی مذکورہ مسجد کی شہادت کے ساتھ ہی تاریخ پاکستان کے وہ لمحات آنکھوں کے سامنے ہجوم در ہجوم پھرنے لگے، جب چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان نے قیام پاکستان کی خاطر دامے، درمے، قدمے، سخنے اپنی تر خداداد صلاحیتیں وقف کر دیں۔

یاد رہے ڈسکہ کی اس شہید مسجد کو تعمیر کروانے والے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب اس وقت قائداعظم کی ایک آواز پر سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کی خدمت کیلئے حاضر ہو گئے تھے۔ جب راجہ صاحب بھوپال نے ہزاروں روپیہ تنخواہ پر ان کی خداداد صلاحیتوں و خدمات کو اپنی ریاست کیلئے چن لیا تھا۔لیکن جب قائداعظم نے چوہدری صاحب کو نوزائیدہ مملکت پاکستان کی خدمت کیلئے بلایا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، خدمت پاکستان کیلئے حاضر ہو گئے۔

یہاں ضروری معلوم ہوا کہ چوہدری صاحب کی پاکستان اور عالم اسلام کیلئے ان خدمات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، جس کو پاکستان کی موجودہ صوبائی کم ظرف ومتعصب انتظامیہ نے مخالف قیام پاکستان ملاوں کی اشیر باد کے عین مطابق ایک ذمہ دار انتظامیہ پر عائد شدہ ذمہ داریوں کو قطعی پس پشت ڈالتے ہوئے، بانئ پاکستان کے ایک معتمد وجانثار ساتھی کی تعمیر کردہ مسجد کو شہید کرنے کا نہایت ظالمانہ، قابل مذمت وانتہائی گھناونا کردار ادا کیا ہے۔

جب پاکستان میں 23 مارچ کو قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کی یاد منائی جاتی ہے، تو یاد رہے کہ اس قرارداد کا اولین مسودہ، چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کے قلم کا ہی مرہون منت ہے۔

انگریزی اخبار ڈیلی ٹائمز" میں چھپا مضمون

چنانچہ اس حقیقت کو پاکستان کا ایک انگریزی اخبار" ڈیلی ٹائمز"، اپنی 22/ دسمبر 2012ء کی اشاعت میں اسلام آباد کی معروف یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے لیکچرار جناب حسین احمد کے لکھے مضمون میں یوں منکشف کرتا ہے:۔

"یہ سر ظفر اللہ خان ہی تھے جنہوں نے قرارداد لاہور کا بھی مسودہ تیار کیا تھا۔ جس میں پہلی دفعہ پاکستان کا تصور پیش کیا گیا تھا-سر ظفر اللہ خان کا تعلق بہرحال احمدیہ کمیونٹی سے تھا۔ اس لئے اس سلسلہ میں ان کے کردار کو سالہا سال تک صیغہ راز میں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ حال ہی میں وائسرائے ہند ارڈ لنتھگو کی تحریر کردہ دستاویزات اور خطوط نے سر ظفر اللہ خان کے کردار کی مرکزی حیثیت کو منکشف کر دیا ہے۔"

مورخ پاکستان عاشق حسین بٹالوی کے تاثرات

قائداعظم کے رفیق، مورخ پاکستان جناب عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:-

”یہ احساس مجھے ابتک پریشان کر رہا ہے کہ ہم نے سات سالوں (1940ء تا 1947ء) تقسیم ہند کا کوئی نقشہ ، کوئی فارمولا، کوئی بلیو پرنٹ تیار نہ کیا۔سات سال مسلسل نعروں ، تقریروں اور بیان بازیوں میں صرف کر دیئے ۔ بالآخر جب قرارداد لاہور کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو چوہدری ظفر اللہ خان کو صرف تین دن کی مدت دی گئی کہ اس قلیل عرصہ میں تن تنہا بیٹھ کر (مسلم لیگ کا) کیس بھی تیار کریں اور گذشتہ ایک سوسال کا تاریخی مواد بھی مہیا کریں ۔“

(”ہماری قومی جدجہد“ صفحہ 134)

محترم چوہدری صاحب کی خدمات جلیلہ صرف مسودہ قرارداد تک ہی محدود نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کیلئے ان کی خدمات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ، ان کے اپنے وطن پاکستان کیلئے ہی ان کی خدمات کا تذکرہ و دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ بزبان غالب ع

اک سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے !

اب اگر صرف کشمیر کے مسئلہ کو ہی لے لیا جائے ، جو دونوں ممالک میں ابتداء سے ہی وجہء تنازعہ بنا ہوا ہے ۔ تو اس ایک مسئلہ پر ہی محترم چوہدری صاحب کا کردار نہ صرف ناقابل فراموش بلکہ اسے بیان کرنے کیلئے بھی ضخیم کتب درکار ہیں۔

خضر وزارت کے استعفی کی کامیاب مساعی

برطانوی حکومت تمام اختیارات ہندوستان کو سپرد کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔مگر چونکہ برطانوی وزیر اعظم ایٹلی حکومت کے اعلان اور وزارتی مشن کے فارمولا کیمطابق انتقال اقتدار ابتدا صوبوں کو ہونیوالا تھا۔ اور صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت کی بجائے یونینسٹ وزارت قائم تھی۔ جسکے وزیر اعظم (اس وقت صوبوں کا وزیر اعلیٰ وزیر اعظم ہی کہلاتا تھا) - کی موجودگی میں پنجاب کے پاکستان میں شامل ہونیکا کے کا امکان قطعی طور پر مخدوش تھا اس وقت پنجاب کے وزیر اعظم سردار خضر حیات ٹوانہ تھے ۔ حد یہ ہے کہ قائداعظم رح کے مشورے پر پنجاب کے مسلم لیگی اکابر نے انتہائی کوشش کی کہ سردار خضر حیات کو اپنے منصب سے مستعفی ہوجانے پر آمادہ کرلیں لیکن ان کی مساعی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

اس انتہائی نازک اور پریشان موقع پر چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب بنفس نفیس لاہور آئے اور اپنی فراست اور دلائل کی معقولیت سے سردار خضر حیات کو مستعفی ہوجانے پر آمادہ کرلیا چنانچہ صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت بننے کی راہ کھل گئی اور قائداعظم نے اس غیر معمولی واقع پر بے پناہ مسرت و اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے جماعت احمدیہ کا شکریہ ادا کیا۔

اخبار ”ٹریبون“ نے 5 مارچ 1947ء کی اشاعت میں لکھا:-

”معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خضر حیات خاں نے یہ فیصلہ سر ظفر اللہ خان کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق کیا ہے۔“

مسلمانوں کے مشہور اور قدیمی ہفت روزہ ”پیسہ اخبار“ لاہور نے اپنی 10 مارچ 1947 کی اشاعت میں، نیز ”ٹرانسفر آف پاور مارچ 1947 میں واضح طور پر درج ہے کہ وزیر اعظم پنجاب جناب خضر حیات نے استعفی سے

چوہدری محمد ظفر اللہ خان سے مشورہ کیا اور پھر مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔

ہندو اخبار ”ملاپ“ مورخہ 20 فروری 1947 کی اشاعت میں لکھتا ہے:-

”یہ ایک واضح بات ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے خضر حیات کو مجبور کر کے اس سے استعفاء دلایا۔خضر حیات خان کا استعفاء مسلم لیگ کی وزارت بننے کا پیش خیمہ تھا - اگر خضر وزارت نہ ٹوٹتی تو آج پنجاب کی یہ حالت نہ ہوتی۔“

پس یہ وہ ناقابل تردید حقائق ہیں (یعنی پنجاب کے پاکستان میں شامل ہونیکی) جس کو کوئی بھی غیر جانبدار مورخ نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن آج حقیقت احوال یہ ہے کہ ایک تو ویسے ہی قحط الرجال ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خود ساختہ اکابر دین خدائی فوجداروں اور سیاسی بزرجمہروں کی پاکستان میں بن آئی ہوئی ہے۔ بقول شاعر ع

ہوئی ہے شعلہ نوائی وہ برسر منبر
محبتیں جو کبھی تھیں, رہیں نہیں باقی

اب ہم آجاتے ہیں سفارتکاری کے محاذ کی طرف ۔ دراصل جب بھی کوئی سفارت کار کسی اہم مسئلہ پر سفارتی جنگ لڑتا ہے تو اس کی کارکردگی کا اسی طرح جائزہ لیا جاتا ہے جس طرح میدان جنگ میں کسی جرنیل کی کارکردگی کو پرکھ کر اس کی صلاحیتوں کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہاں تین امور کا جائزہ لینا مطلوب ہے۔ پہلی حضرت چوہدری صاحب کے ساتھیوں کی رائے ۔ دوسری مخالفین پاکستان کی رائے ۔ اور تیسری غیر جانبدار مورخین کی رائے ۔

چنانچہ اس ضمن میں چوہدری صاحب کے ساتھیوں کی آپ کے بارے کیا رائے تھی؟ پہلے وہ بیان کی جاتی ہے۔

سابقہ صدر آزاد کشمیر و سلامتی کونسل میں پاکستانی وفد کے رکن سردار محمد ابراہیم خان کے تاثرات

سلامتی کونسل میں پاکستان کے وفد میں آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار محمد ابراہیم خان صاحب بھی شامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"سلامتی کونسل کے اجلاس میں ناکامی کے بعد بھارتی مندوب سر گوپال سوامی آئنگر اور شیخ عبداللہ کے درمیان آپس میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی۔ کیونکہ شیخ عبداللہ صاحب سر آئنکر پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ پاکستان کے مندوب اور وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ کا مقابلہ کرنیکی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ۔۔۔۔ چنانچہ بھارت کے دونوں نمائندے اسی طرح ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے نیویارک سے نئی دہلی روانہ ہوگئے۔"

("کشمیر کی جنگ آزادی" مصنفہ سردار محمد ابراہیم خان - ناشر کلاسیک لاہور مارچ 1966ء صفحہ 1966)

پاکستان کے سابق وزیر خزانہ و وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی رائے

اس وقت کے پاکستان کے وفد کے ایک اور رکن چوہدری محمد علی صاحب (جو بعد میں پاکستان کے وزیر خزانہ اور پھر وزیر اعظم بھی بنے (اپنی انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب میں رقمطراز ہیں:-

ترجمہ: "ظفر اللہ خان کے ماہرانہ تجزیے نے سلامتی کونسل میں اس بات کو منوا لیا کہ مسئلہ صرف نام نہاد حملہ آوروں کو کشمیر سے نکالنے کا نہیں تھا۔"

Ali, C.M - (1965) - The Emergence of Pak-istan.Lahore, Pakistan: Research Societyof Pakistan (Page:301

یہی چوہدری محمد علی اپنی ایک دوسری کتاب "ظہور پاکستان" کے صفحہ 445 پر تحریر فرماتے ہیں:-

"عالم اسلام کی آزادی، استحکام، خوشحالی اور اتحاد کیلئے کوشاں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل مقصد ہے۔ حکومت پاکستان کا ایک اولین اقدام یہ تھا کہ شرق الاوسط کے ملکوں میں ایک خیر سگالی وفد بھیجا گیا۔ پاکستان نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کو اپنا مسئلہ سمجھا اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اس کے فصیح ترجمان تھے۔ علاوہ ازیں انڈونیشیا، ملایا، سوڈان، لیبیا، تیونس، مراکش، نائجیریا اور الجزائر کی آزادی کی مکمل حمایت کی گئی۔"

واضح رہے کہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے مذکورہ ممالک کی آزادی کی خاطر اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کر کے ان ممالک کو آزادی جیسی نعمت سے ہمکنار کروایا۔ چنانچہ ان ممالک نے چوہدری صاحب کو اپنے قومی اعزازات سے بھی نوازا۔

آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس محمد یوسف صراف کے تاثرات

آزاد کشمیر کی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس محمد یوسف صراف صاحب اپنی انگریزی خودنوشت: Kashmiri Fight For Freedom میں لکھتے ہیں:-

ترجمہ: "سر ظفر اللہ کی قیادت میں پاکستان کے وفد نے جو شاندار کردار ادا کیا، اس کا جائزہ لینا چاہئے۔ سر ظفر اللہ نے جس شاندار طریق پر ہمارے مقدمہ کی تفصیلات پیش کیں، اس نے دھوکا دینے والی اور میکاولین انداز کی شکایت کو اس کے صحیح مقام یعنی ملزم کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیا۔ اس نے انہیں پاکستان کی تاریخ میں ایک قابل فخر مقام دلا دیا۔ اور کشمیری، نسل در نسل احساس تشکر کیساتھ ان کو یاد رکھیں گے۔...

سر ظفر اللہ نے کشمیر کاز کو بڑے شاندار طریقے سے پیش کیا۔ انہوں نے سیکیورٹی کونسل میں پانچ گھنٹے تقریر کر کے ایک ریکارڈ قائم کر دیا...

کشمیریوں کی حالت زار کا جو نقشہ سر ظفر اللہ خان نے کھینچا، اس سے انکی اپنی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور بہت سے نمائندوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہتے دیکھے گئے۔

سر ظفر اللہ نے کشمیر کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ کسطرح کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے ایک معمولی رقم کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی سے خرید لیا تھا...

ہندوستان بظاہر اعلی اخلاق کے لبادے میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس کا جواب چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے اس ضرب المثل سے دیا کہ "ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور"- اس ذکر پر پنڈت نہرو اتنا سٹپٹائے کہ وہ

غیر اخلاقی زبان استعمال کرنے پر اتر آئے

(''کشمیریز فائٹ فار فریڈم'' صفحہ 1049)

پاکستانی سفیر برائے امریکہ و قائد اعظم کے دیرینہ ساتھی حسن اصفہانی کا ایک خط

قائد اعظم کے نام پاکستانی سفیر برائے امریکہ مسٹر حسن اصفہانی کا ایک خط انکی کتاب میں بتاریخ 17 فروری 1948ء، کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ کی بابت بھی شائع شدہ موجود ہے۔ اس میں مسٹر اصفہانی، قائد اعظم کے نام لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:۔

ترجمہ:۔''ظفر اللہ خان نے شیخ عبداللہ (کے موقف) کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں...!''

کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ

چنانچہ یہی کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ صاحب جو کہ UNO میں بھارتی وفد کے ایک اہم ممبر تھے۔ وہ اپنی کتاب '' آتش چنار'' میں لکھتے ہیں:۔

سر ظفر اللہ ایک ہوشیار بیرسٹر تھے۔ انہوں نے بڑی ذہانت اور چالاکی کا مظاہرہ کر کے ہماری محدود سی شکایت کو ایک وسیع مسئلے کا روپ دے دیا۔ اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کے سارے پر آشوب پس منظر کو اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ ہندوستان پر لازم تھا کہ وہ اپنی شکایات کا دائرہ کشمیر تک ہی محدود رکھتا۔ لیکن وہ سر ظفر اللہ کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا ہم چلے تو تھے مستغیث بن کر، لیکن ایک ملزم کی حیثیت سے کھڑے کر دیئے گئے...''

(''آتش چنار''۔مصنفہ شیخ محمد عبداللہ۔ پبلشر علی محمد اینڈ سنز، سری نگر کشمیر ایڈیشن اول: 1986ء صفحہ: 473)

کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک بھارتی رکن اسمبلی کی رائے

پروفیسر بال راج مادھوک جو کہ دو مرتبہ بھارتی پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ اور ان کا تعلق بھی کشمیر سے تھا، انگریزی میں لکھتے ہیں:۔

ترجمہ: ''پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ انہوں نے (یعنی شیخ عبداللہ صاحب نے) مختلف مواقع پر جو بیانات دیئے تھے اور تقاریر کی تھیں۔ اور پنڈت نہرو کے بیانات اور تقاریر نے ظفر اللہ کے ہاتھ میں وہ چھڑی پکڑا دی تھی، جس سے وہ ہندوستان کی پٹائی کرتے رہے۔''

Kasmir the Storm Center of the world. By Bal

(Raj Madhok, page: 53

ایک امریکی مورخ کا اظہار خیال

اب یہ جائزہ لیتے ہیں کہ غیر جانبدار مورخین کی کشمیر کے معاملہ میں کیا رائے ہے؟ امریکی مورخ پروفیسر سٹینلے وولپرٹ (Stanley Wolpert) جو کہ برصغیر کی تاریخ پر ایک سند رکھتے ہیں۔ نیز بہت سی کتب کے مصنف تھے۔ جناح صاحب کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ):''جناح کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ پاکستان اور بھارت کے معاملہ میں بحث کیلئے نیویارک کا سفر کر سکیں۔ لیکن پاکستان کے وزیر خارجہ نے پاکستان کے وکیل کی حیثیت سے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ سلیس اور اکثر فصیح انداز میں ہندوستان کے الزامات کو رد کرتے رہے۔''

Wolpert S. (2000) Jinnah of Pakistan

(Karachi. Oxford

University Press P: 357)

ایک برطانوی مصنف کے تاثرات

مسٹر ایچ ڈی ہڈسن اپنی کتاب ''The Great Divide'' میں لکھتے ہیں:

ترجمہ:''جس طرح ہندوستان کی اپیل کو سلامتی کونسل میں سنا گیا، اس سے ہندوستان کی حکومت کو سخت مایوسی ہوئی۔ ان کی بچگانہ سوچ تھی کہ سلامتی کونسل فورا بغیر کسی جھجک کے ہندوستان کی حمایت کرتے ہوئے، اس کو جارحیت کا نشانہ قرار دیگی۔ لیکن اس کے نمائندے، پاکستان کے سر محمد ظفر اللہ خان کے مقابلے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے تھے پنڈت نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ ہمیں اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے جانے پر سخت افسوس ہو رہا ہے۔''

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ آکسفورڈ۔ نیویارک

Hodson H.V.1969 - The great)

(Divide. London, UK, Hutchinson & Co

قدیم برطانوی اخبار لندن ٹائمز کا اداریہ

سیکیورٹی کونسل میں بحث نے جو رخ اختیار کیا، اس سے ہندوستان کے تخیل اور فکر کو سخت دھچکہ لگا۔ ہندوستان اپنے کیس کو اس درجہ مضبوط خیال کرتا تھا کہ

گویا وہ ہر قسم کی تردید سے بالا تر ہے۔ اور اسے یقین تھا کہ اقوام متحدہ فوری طور پر پاکستان کو سرزنش کریگی۔ اور کشمیر کے معاملے کو سلجھانے میں ہندوستان کو آزاد چھوڑ دیگی۔ لیکن چوہدری ظفر اللہ خان نے کمال قابلیت سے پاکستان کی طرف سے اس طرح صفائی پیش کی کہ کونسل کے اکثر ممبران پر واضح ہوگیا کہ ہندوستان کی طرف سے معاملات کو مکمل صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس درجہ موثر انداز میں کی کہ سیکیورٹی کونسل ان کے استدلال سے مرعوب ہوگئی۔"

(اخبار "لندن ٹائمز" مورخہ 14 جولائی 1948ء)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ

تحریک پاکستان کے اس جید و بے لوث راہنما اور قائداعظم کے مخلص ساتھی چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کی کی طرف سے تعمیر شدہ خانہ خدا کو، جس طریق سے خدا اور آخرت کے خوف سے قطعا بے خوف ہو کر زمیں بوس کیا گیا اس پر پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس ایم آر کیانی مرحوم کی ایک تحریر بے اختیار یاد آتی چلی گئی۔ جناب محمد رستم کیانی اپنی "خود نوشت" میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے نہایت ہی ذمہ دار شخص نے بتایا کہ 1947ء میں جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے تو وہ پاکستان کی 2 نہایت قیمتی چیزیں "کنفیڈنشل بکس" Confidential Box میں بند کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ اور ہمیں اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ یہ بات سنکر مجھے پریشانی لاحق ہوئی اور میں نے رازدارانہ انداز میں اس ذمہ دار شخص سے پوچھا:۔

"تمہیں معلوم ہے وہ کیا چیزیں تھیں!؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرا شوق تجسس اور بڑھ گیا۔ میں اسکے اور قریب آ گیا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے راز بتا دینے کی استدعا کی۔ اس نے کہا:۔

"انگریز، خدا اور آخرت کا خوف اور قانون کا احترام اپنے ساتھ لے گیا"

یہ سنکر میں نے اپنے دل کو ٹٹولا، وہ ان دونوں چیزوں سے خالی تھا...!!"

("افکار پریشاں"۔۔۔۔۔جسٹس ایم آر کیانی)

جسٹس کیانی کے مندرجہ بالا فکر انگیز الفاظ پڑھ کر معروف شاعر احسان دانش مرحوم کے یہ اشعار، بے اختیار ذہن کے دریچوں سے ٹکراتے محسوس ہونے لگے۔...ع

یہ ڈھلتی رات، یہ سوئی منڈیریں، مضمل تارے
مجھے اس وقت کی گونگی فضا کچھ اور کہتی ہے
تعصب نے یہاں کھینچی ہیں انسانوں میں دیواریں
ابھی اس ملک کی آب و ہوا کچھ اور کہتی ہے

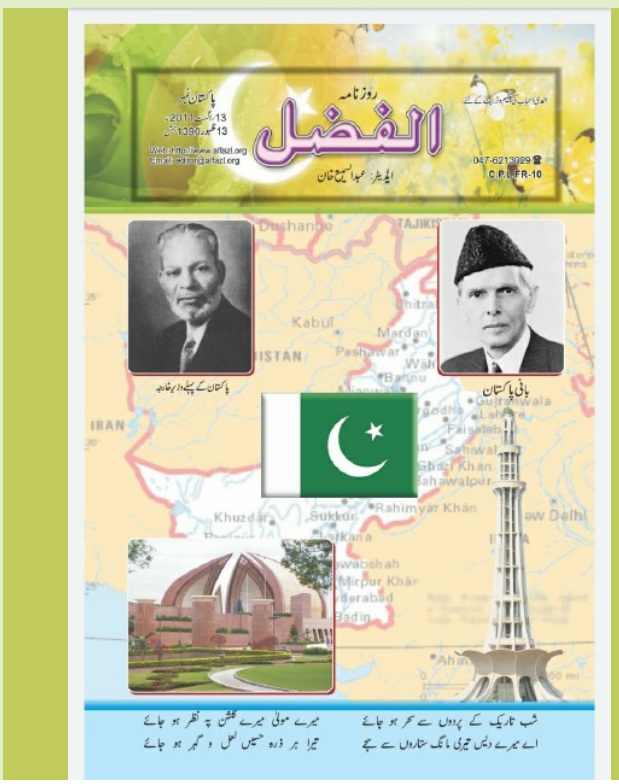

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان قیام پاکستان کے بعد تقریباً سات برس تک وزیر خارجہ رہے۔ اور اس دوران میں انہوں نے اقوام متحدہ میں بھی پاکستان کے مندوبِ اعلیٰ کے طور پر فرائض ادا کئے۔ وہاں جنرل اسمبلی کی صدارت کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کے علاوہ فلسطین اور کئی عرب ملکوں (مراکش، تیونس، لیبیا) کے حق آزادی و خود مختاری کی وکالت میں پاکستان کا نقطہ نظر جس انداز میں پیش کیا اُسے عرب ملکوں میں اب تک سراہا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صدرِ محترم کے علاوہ سعودی سفیر بھی اُن کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ وزارتِ خارجہ کی سربراہی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عالمی عدالتِ انصاف کے رکن بن گئے اور دوسری میعاد کے لئے منتخب ہونے کے بعد اُس کے صدر بھی رہے۔ اس دوران میں وہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر بھی منتخب ہوئے۔

قادیانی ہونے کی نسبت سے پاکستان میں اُن کے خلاف اعتراض و احتجاج کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا لیکن قائداعظم اور پھر لیاقت علی خاں مرحوم نے انہیں بہت اہم ذمہ داریاں سپرد کیں۔۔۔ 1953ء کی اینٹی قادیانی تحریک سے قبل اسلامیانِ ہند کے قومی معاملات میں سر آغاخان کی طرح، سر محمد ظفراللہ خاں کا حصہ و کردار بھی بہت نمایاں رہا تھا۔ 1930ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر بھی بنائے گئے تھے اور 1931ء میں اور بعد کی گول میز کانفرنسوں میں وہ علامہ اقبال، قائداعظم اور دوسرے اکابر کے ساتھ مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر شامل ہوتے رہے۔

(ادارہ نوائے وقت 3 دسمبر 1985ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سر محمد ظفر اللہ خان

از شہزادی عابدہ سلطانہ والئی بھوپال کی ولیعہد

"میں ظفر اللہ خان کو ہمیشہ اُن کی حُبّ الوطنی اور اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر یاد رکھوں گی۔ وہ بااصول تھے۔ اپنے مقاصد کے لئے وقف، مہربان، زیرک، اُن کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور اُن میں ایک عجیب صلاحیت یہ تھی کہ وہ دو سیکنڈ کے اندر ایک پورا صفحہ پڑھ لیتے تھے۔ جیسے وہ پڑھتے نہ ہوں بلکہ اُن کا دماغ صفحے کی تصویر لے لیتا ہو۔ سب سے بڑی بات ظفر اللہ خان ایک منکسر المزاج، ہمدرد، تیز فہم، شخص تھے۔ میں پاکستان کے لئے یہ بات قابلِ شرم سمجھتی ہوں کہ اُن کے عقائد کی بناء پر اُن کی عظیم خدمات پر پردہ ڈالا گیا اور اس طرح اُن کی خوبیوں کو قوم سے چھپایا گیا۔ یہی عصبیت واحد نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان پروفیسر عبدالسلام پر نازل ہوئی۔" (مقتبس از "ایک انقلابی خاتون کی سرگذشت")

حُسن اتفاق سے

از حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان رضی اللہ عنہ

''اُردن میں دوسری مرتبہ شاہ حسین کی خدمت میں باریابی

اِس دفعہ ڈاکٹر وقار احمد ہمدانی صاحب جو دمشق میں پاکستانی سفیر تھے اور اُردن اور شام کے درمیان عارضی ناچاقی کی وجہ سے اُردن کی طرف سے دمشق میں قائم بالامور تھے، میرے ہمراہ تھے۔ اُردن کی حدود میں داخل ہوتے ہی محکمۂ استقبال کی طرف سے چائے کا انتظام تھا۔ پریس کا ایک نوجوان لوکل نمائندہ بھی موجود تھا۔ اُس نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے طور پر

سوال کیا عمان کس غرض سے جا رہے ہیں؟

مَیں نے کہا ایک دوست سے ملاقات کے لئے۔

پوچھا کیا جلالۃ الملک کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ہوگا؟

مَیں نے کہا یہاں جو میرے دوست ہیں اُن کا نام حسین بن طلال ہے حُسنِ اتفاق سے وہ اُردن کے بادشاہ بھی ہیں۔ دوست کو بادشاہ پر سبقت ہے۔ وہ نوجوان میرا منہ تکنے لگا۔ مَیں نے یہ گفتگو جلالۃ الملک کے حضور دُہرا دی۔ بہت خوش ہوئے۔

(تحدیث نعمت صفحہ ۵۹۷)

ٹی آئی کالج ربوہ سے وابستہ کچھ سنہری یادیں:

1969میں ٹی آئی کالج کے statistics کے طلبا پروفیسر سعید اللہ خان صاحب کی سرکردگی میں ایک سہ روزہ سٹڈی ٹور پر لاہور گئے ۔ اس ٹور میں پنجاب یونیورسٹی کے statistics department کے وزٹ کے علاوہ بعض تاریخی مقامات کا وزٹ بھی کیا گیا۔
اس ٹورمیں شامل طلباء کا ایک گروپ فوٹو **(مرسلہ: مشہود الحق)**

تعلیم الاسلام کالج

عبدالحمید حمیدی

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے 3 جنوری 1898ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام کی بنیاد رکھی۔ تین سال بعد کالج بنادیا گیا۔ دو سال تک کامیابی سے چلتا رہا اس کے نتائج بھی عمدہ تھے مگر حکومت کے کالج، یونیورسٹی کمیشن کی کڑی شرائط کے باعث اسے بند کر دینا پڑا۔ تاہم امام الزمان کی دعائیں قریباً 40 سال بعد رنگ لائیں اور 1944ء میں اس کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے خطابات سے اقتباس

تعلیم الاسلام کالج عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ پہلے برصغیر میں جاری ہوا۔ بعد ازاں پاکستان میں قیام ہوا۔ اس درس گاہ سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء نے دنیا میں پھیل جانے کے بعد نہ صرف اس عظیم درس گاہ کی نیک شہرت کو دوام بخشا بلکہ اس کے ماٹو علم و عمل کو سر بلند کرتے ہوئے، یہاں سے سیکھے ہوئے علوم اور اعلیٰ اخلاق کو ساری دنیا میں پھیلاتے ہوئے اس درس گاہ کے نام کو روشن کیا۔ یہ مبارک سلسلہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو قیامت تک چلتا چلا جائے گا۔ اس کالج کی نیک شہرت نہ ماند پڑے گی، نہ فراموش کی جاسکے گی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضور کے فرزند ارجمند حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا احسان ہے کہ تعلیم الاسلام کالج بنا۔ حضرت صاحب زادہ مرزا ناصر احمد صاحب، حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ جیسا وجود پرنسپل بنا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اس عظیم درس گاہ سے منسلک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

کالج کی منظوری کس طرح ہوئی۔

1944ء میں پنجاب یونیورسٹی کا کمیشن جائزہ لینے کے لئے پہنچا۔ یونیورسٹی نے مطالبہ کیا کہ 25,000 روپے نقد مجوزہ احمدیہ کالج کے نام پر بنک میں جمع کرایا جائے۔ جماعت نے یہ مطالبہ پورا کر دیا۔

پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے، فروری 1944ء کے اجلاس میں یونیورسٹی سینیٹ نے حکومت کے پاس سفارش کی اور 2 جون 1944ء کو کالج کی باقاعدہ منظوری ہوگئی۔

حضرت مصلح موعودؓ کی طرف سے اخراجات کالج کی تحریک اور مخلصین کی قربانی۔

جماعت نے جو رقم ادا کی تھی وہ قرض تھی۔ حضرت مصلح موعودؓ نے 24 مارچ 1944ء کے خطبہ جمعہ میں اور 19/اپریل کو مجلس مشاورت میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی تحریک فرمائی۔ اور کالج کی افادیت پر نہایت مؤثر رنگ میں روشنی ڈالی۔ اس تحریک کا خدا کے فضل سے مخلصین جماعت کی طرف سے پر زور خیر مقدم کیا گیا اور ایک خطیر رقم جمع ہوگئی۔

سب سے پہلی تقلیدی مثال خود حضور انور نے دی۔ آپؓ نے کالج کی منظوری دیتے ہی پہلے اپنی طرف سے 5,000 سے اور بعد ازاں جملہ اہل بیت کی طرف سے 6،000 روپے عنایت فرمائے۔

حضرت مصلح موعودؓ نے 4 جون 1944ء کو کالج کی افتتاحی تقریب سے خطاب فرمایا:

جہاں تک تعلیمی سوال ہے یہ کالج اپنے دروازہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے کھلے رکھتا ہے کیونکہ تعلیم کا حصول کسی ایک قوم کے لئے نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیم کو بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہر انسان کے لئے ممکن اور سہل بنا دیں۔

پھر فرماتے ہیں۔

پس میری غرض کالج کے قیام سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمیں ایک ایسا مرکز مل جائے جس میں ہم بیج کے طور پر تمام باتوں کو قائم کر دیں تا کہ آہستہ آہستہ اس بیج کے ذریعے ایک ایسا درخت قائم ہو جائے۔ ایک ایسا نظام قائم ہو جائے۔ ایک ایسا ماحول بن جائے جو اسلام کی مدد کرنے والا ہو۔

حضور فرماتے ہیں۔تعلیم کو آسان اور سہل بنائیں، کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے جسے طالبعلم برداشت نہ کر سکے۔ تا کہ ایسا نہ ہو کہ غریب لڑکے اس بوجھ کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائیں۔

ہمارے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں۔

ہماری تعلیم الاسلام کالج کی اپنی روایات ہیں۔ اس میں احمدی بھی پڑھتے تھے اور غیر از جماعت بھی پڑھتے تھے لیکن سب بڑے پیار اور محبت سے رہتے تھے۔اس دَور کے سٹوڈنٹس سے اگر بعض غیر احمدیوں سے رابطے اور تعلقات ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ مزید قدم آگے بڑھائیں۔ اور انہیں پیار اور محبت کی طرف بلائیں۔ جو اس مادر علمی کا اثاثہ ہے۔ اس سے کچھ نہ کچھ انسانی قدریں تو پامال ہونے سے بچیں گی ۔ اور یقیناً ایک اچھے ماحول کی ترویج شروع ہو گی۔ اللہ توفیق دے ۔آمین۔

24 ستمبر 2011ء ٹکوساجرمنی سے خطاب۔

حضور نے فرمایا۔اس ایسوسی ایشن کو قائم ہوئے 6 سال ہو گئے ۔انسانی زندگی کے لحاظ سے تو یہ بھی نوزائیدہ بچہ کی طرح تھی جو چند مہینے کا ہوتا ہے۔تو تین چار سال تک انفینٹ کہلاتا ہے بلکہ اس سے نکل کر بچپنے میں داخل ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ بچپنا ان لوگوں کا ہے جن کی داڑھیاں سفید ہو چکی ہیں۔ اس لئے آپ کا جو معیار ہے وہ بچپنے کا معیار نہیں رہنا چاہیے۔ کہہ لیں کہ بوڑھے لوگوں کی تنظیم کا ابتدائی دور ہے۔ یا بوڑھے لوگوں کا بچپنا ہے۔قرآن کریم میں ارزل العمر کا ذکر ہے جہاں پھر بچپنے کی طرف واپسی شروع ہو جاتی ہے۔

فرمایا۔بعض کام جو ہونے چاہیے تھے نہ ہی صدر نہ انظامیہ کرسکتی ہے۔ جب تک ہر ممبر میں جوش اور جزبہ نہ ہو۔

پھر فرمایا۔جن لوگوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے دَور میں وقت گزارا۔ کہ کس طرح ماں سے بڑھ کر اس درس گاہ نے ہمیں سنبھالا۔ پس اس درس گاہ کا یہ حق بنتا ہے کہ اس میں پڑھنے والے وہ لوگ جنہوں نے اس کے نام پر ایک ایسوسی ایشن بنائی ہے۔ اس کی لاج رکھتے ہوئے جو منصوبے بھی بنائے ہیں اس کے پورا کرنے میں اپنا حق ادا کریں۔

پھر فرمایا۔ ٹی آئی کالج کے پڑھے ہوئے لوگ ہیں جنہوں نے ابھی تک ممبر شپ نہیں لی۔ جو ممبر ہیں وہ بھی ایکٹو نہیں ہیں جس طرح ہونا چاہیئے۔ یہ شکوہ جو انتظامہ کو ممبران سے ہے اس کو دُور کرنے کی کوشش کریں تبھی ہم اس ایسوسی ایشن کو ایسی نہج پر چلا سکتے ہیں۔ جب کسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے آپ ایسوسی ایشن کو ذریعہ بنائیں۔جس جذبہ کے ساتھ ایسوسی ایشن بنائی گئی میرا خیال تھا کہ انشاءاللہ اچھا کردار ادا کریں گے۔ ایک تو آرگنائزڈ ہو، کہ کالج کی اپنی ایک انفرادیت قائم ہو جائے گی۔ آپ کے بچوں کو پتا لگے گا کہ ہم لوگ کس طرح اپنی درس گاہ کی روایات کی حفاظت کرنے والے ہیں۔جس نے ہم کو ماں کی طرح پالا۔ اور کیا کیا ذمہ داریاں ہمارے پر ہیں۔جن کو ہم نے پورا کرنا ہے۔

پھر حضور نے فرمایا نے میٹنگ میں بچوں کو ساتھ لائیں۔ ان کی پسند اور دلچسپی کے پروگرام بھی بنائیں۔حضور انور نے فرمایا ربوہ شہر کے لئے بھی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کی رونقیں دوبارہ قائم کرے۔ آمین۔

اب کالج کا یہ حال ہے کہ ایک غیر احمدی استاد نے جو بطور سٹوڈنٹ وہاں پڑھتے رہے تھے لکھا کہ میں ٹی آئی کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔ کیا زمانہ تھا۔ جب یہ درس گاہ سارے علاقے میں مشہور تھی ۔ گیمز میں ، پڑھائی میں، ایک مقام رکھتی تھی ۔ آج وہاں اس کا کوئی پرسان حال نہیں ۔

اب سکول بھی بہت سارے کھل گئے ہیں نئے سکولوں کی عمارتیں بھی تعمیر ہوئی ہیں لیکن پڑھائی کے اخراجات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ایک بڑا بوجھ ہے۔ جو پاکستان کی جماعت برداشت کر رہی ہے۔ اگر باہر کے لوگ بھی ان کی مدد کریں تو بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔حضور نے فرمایا سائنس کے لئے خاص طور لیبارٹریز وغیرہ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔جس پر بڑے اخراجات ہوتے ہیں تو بہت ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ کی کہ آپ اپنی ایسوسی ایشن کو آرگنائز کر کے منصوبہ بندی کریں۔ کہ کس حد تک آپ پاکستان کے غریب احمدی طلبا کی مدد کر سکتے ہیں۔جن کو پڑھائی کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ بہت ساری جگہوں سے احمدی طلبا کو نکالا جاتا ہے کہ تم احمدی ہو۔ ان کو ربوہ میں لایا جاتا ہے۔ وہاں سمونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تا کہ ان کی پڑھائی ضائع نہ ہو۔ جو احمدی طلبا مختلف شہروں میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے وظائف ہیں وہ بھی دئے جاتے ہیں تو بہر حال جماعت کا فرض ہے چاہے یہاں سے مدد جائے یا نہ جائے۔ یا کہیں کوئی اور کرے یا نہ کرے لیکن جو احمدی بچہ ہے اس

کا ٹیلنٹ ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

یو کے ایسوسی ایشن سے خطاب 2011ء

ایسوسی ایشن اس لئے قائم کی گئی تھی کہ اس میں تمام طالب علم شامل ہیں چاہے احمدی ہیں یا غیر از جماعت تا کہ ممبران کو سال کے مختلف وقتوں میں مل بیٹھنے کا موقع میسر آجائے۔ وہ پرانی یادیں تازہ کرسکیں مل بیٹھنا اور آپس میں تفریحی ماحول پیدا کر کے۔ دنیا میں مختلف قسم کے جو بوجھ انسان پر پڑے ہوئے ہیں۔ ان سے کس طرح نجات حاصل کرنا اور یہ موقع پیدا کرنا کہ ہلکے ماحول میں ایسا کٹھ کیا جائے جہاں ایک دوسرے سے کھل کر باتیں بھی ہوں۔ ایک دوسرے کے خیالات بھی سنے جائیں۔ اور تھوڑی بہت انجوائے منٹ بھی ہو جائے۔ لیکن ہمیشہ ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری تفریح اور بے تکلفی کی کچھ حدود ہیں کچھ روایات ہیں۔ جو جماعت کی روایات تھیں وہ کالج میں بھی۔ قائم رہیں۔۔۔ ہماری بے تکلفی کا معیار بے تکلفی کے باوجود وقار کا احساس دل میں رکھتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ ایک دوسرے کی عزت اور عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے بارے میں حضور نے فرمایا۔

پرائمری سکول کا خرچ آج سے چھ، سات سال پہلے پانچ، چھ سو روپے ہوا کرتا تھا آج چھ، سات ہزار ہے۔

ایسوسی ایشن اپنے ممبران سے مستقل رابطہ رکھے۔ ممبران خود ایک جذبہ کے تحت اپنی درس گاہ کے تقدس کو سامنے رکھے اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا حق ادا کریں۔ جب آپ ایک یورو دیتے ہیں تو ایک غریب بچے کے لئے بڑی نعمت ہے۔ جب آپ کے بچے برگر کھاتے ہیں ساتھ ایک ٹن کوک کا پی لیتے ہیں تو کم از کم تین چار یورو خرچ کر لیتے ہیں۔ اگر ایک برگر بچے کا بچالیں۔ اس کو احساس دلا دیں۔

اس طرح پاکستان کے بچوں کا جو وظیفے کی رقم کا وعدہ کیا ہے پورا کریں۔

پھر فرمایا۔۔۔ جیسا کہا ابھی رپورٹ میں تعلیمی امداد کا ذکر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسوسی ایشن کی طرف سے براہ راست نظارت تعلیم ربوہ کو یہ تعلیمی امداد بھجوائی جاتی ہے۔ اور وہاں کئی طالبعلموں کا اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر بھی پروگرام ہونے چاہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہاں ایسے پرانے طالبعلم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آسودہ حالی میسر فرمائی ہوئی ہے۔ اس لئے بعض ایسے پروگرام جو افریقہ میں مثلاً احمدیہ آرکی ٹیکٹس ایسوسی ایشن کے زریعے سے یا ہیومینیٹی فرسٹ کے زریعے سے جاری ہیں۔ ان میں بھی کبھی کبھی ایسوسی ایشن کے نام پر حصہ ڈال لیا کریں۔ اس میں بعض ایسے پراجیکٹ ہیں کہ اگر آپ مکمل طور پر اس میں حصہ ڈالیں تو اس پروجیکٹ پر ٹی آئی کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام کا ڈسپلے بھی ہوسکتا ہے۔ تو ان باتوں پر بھی آپ کو غور کرنا چاہیئے۔ اللہ کرے یہ ایسوسی ایشن ہر لحاظ سے کامیاب ہو اور آئندہ بھی جس وقار کو قائم رکھتے ہوئے اب تک کام سرانجام دیتی رہی ہے وہ جاری رہیں۔

منٹس آف میٹنگ اور سالانہ رپورٹ

16/اکتوبر 2024ء عاملہ کی میٹنگ آن لائین منعقد ہوئی۔ تمام ممبران حاضر تھے۔ میٹنگ کے ایجنڈے کے پوائنٹس درج ذیل ہیں۔

۱۔ ممبرشپ بڑھانا۔ اس کے لئے جی ٹی اے کی مختلف مساجد (بیت المبارک برمنگھم، ابوڈ آف پیس، بیت الحمد، سکاربورو) میں سٹال کا قیام کرنا۔ نماز سینٹرز میں اعلانات وغیرہ۔

۲۔ ممبرز کا ڈیٹا مکمل کرنا۔ نام، فون نمبرز، ای میل ایڈریس، وغیرہ اکٹھا کرنا۔

۳۔ حضور انور کی خدمت میں بھجوانے کے لئے فنڈ کا قیام اور دوستوں کو تحریک کرنا۔

۴۔ جنرل باڈی میٹنگ اور ڈنر کا اہتمام (Get togather)

سالانہ رپورٹ

سال رواں میں مارچ کے مہینے میں پہلے جنرل باڈی میٹنگ اور مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ جس کی صدارت محترم جناب امیر صاحب کینیڈا نے فرمائی۔ اس میٹنگ میں نومنتخب عہدے داران کا تعارف، سالانہ ممبرشپ 30 ڈالر مقرر کرنے کا اعلان، تنظیم کے اغراض و مقاصد، تعلیم الاسلام کالج کی قادیان میں ابتدا کا ذکر ہوا، بعد ازاں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ممتاز شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ میٹنگ کے اختتام پر حاضرین کی خدمت میں لذیز کھانا پیش کیا گیا۔

دوسری جنرل باڈی میٹنگ 9 ستمبر 2024ء کو ندیم نذیر صاحب کی رہائش گاہ

واقع کنگ سٹی منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں مشہور شاعر مبارک صدیقی صاحب مہمانِ خصوصی تھے۔ محترم امیر صاحب کینیڈا، محترم مشنری انچارج صاحب، مکرم ہادی علی چودھری صاحب نائب امیر کینیڈا، جناب عبدالحمید وڑائچ صاحب صدر انصار اللہ کینیڈا نے بھی شرکت فرمائی۔ مبارک صدیقی صاحب نے اپنے خوبصورت کلام سے نوازا اور چند مقامی شعرا نے بھی کلام پیش کیا۔ اہل خانہ نے حاضرین کی خدمت عشائیہ پیش کیا۔ ایک صد سے زائد مہمانوں نے شرکت کی۔

تنظیم کے اغراض و مقاصد

ہمارے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس ایسوسی ایشن کو قائم فرمایا۔ اس کے اغراض و مقاصد آپ کے خطابات کی روشنی میں تحریر کیے ہیں۔

۱۔ سب سے اولین مقصد پاکستان کے غریب احمدی طلبا کے لئے تعلیمی وظائف کا قیام اور نظارت تعلیم کی معرفت متاثرہ طلبا تک وسائل کی رسائی۔

۲۔ ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا ترجمان المنار کا قیام۔

۳۔ سٹوڈنٹس کو تحریک کرنا، توجہ دلانا کہ میٹنگ میں اپنے بچوں کو بھی ساتھ لائیں تا کہ اگلی نسلوں کو کالج کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔

۴۔ سالانہ میٹنگ کے علاوہ سالانہ پکنک اور ٹوور کا اہتمام جس میں سٹوڈنٹس کی دلچسپی کے لئے کھیلوں کا انعقاد کرنا۔

۵۔ کالج کے غیر از جماعت سابقہ طالبعلموں سے رابطہ کی کوشش کرنا، اور ان کو تنظیم میں فعال کردار ادا کرنے کی طرف لے کر آنا۔

۶۔ ممبران میں عمومی طور پر جذبہ خدمت خلق پروان چڑھانا اور جماعت کے دیگر خدمت خلق منصوبوں میں شمولیت کی تحریک کرنا۔ مثال کے طور پر بعض ایسے پروگرام جو افریقہ میں احمدیہ آرکی ٹیکٹ ایسوسی ایشن کے ذریعے یا ہیومینٹی فسٹ کے ذریعے واٹر ویل، مساجد کی تعمیر ہسپتالوں اور سکولوں کا قیام کرنا۔

15دسمبر 2024 کو ٹکوسا کی جنرل باڈی میٹنگ کی جھلکیاں

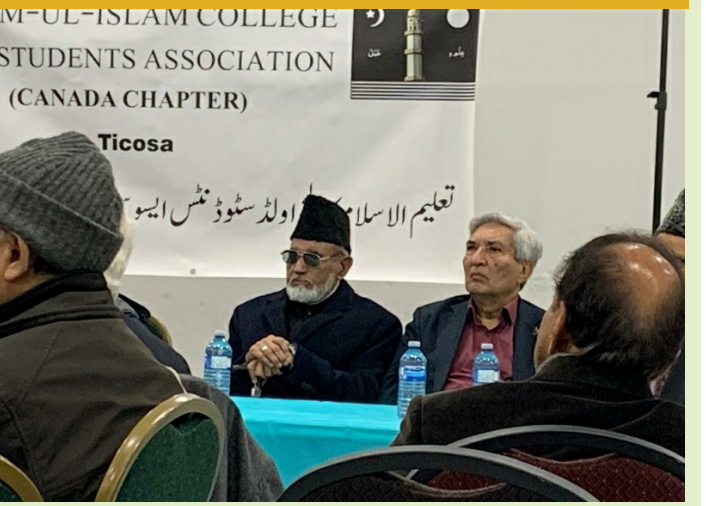

15دسمبر 2024 کو ٹکوسا کی جنرل باڈی میٹنگ کی جھلکیاں

15دسمبر 2024 کو ٹکوسا کی جنرل باڈی میٹنگ کی جھلکیاں

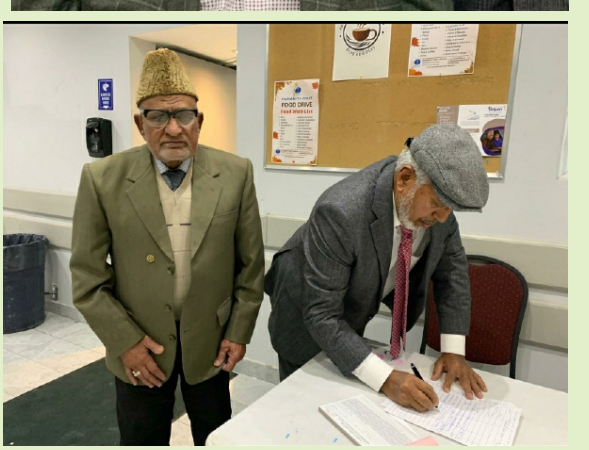

15دسمبر 2024 کو ٹکوسا کی جنرل باڈی میٹنگ کی جھلکیاں

9 ستمبر 2024 کو مکرم مبارک صدیقی صاحب کیساتھ منائی جانیوالی ایک تقریب کی جھلکیاں

تعلیم الاسلام کالج کے دو پرانے اساتذہ کرام کی تقریب میں رونق افزائی

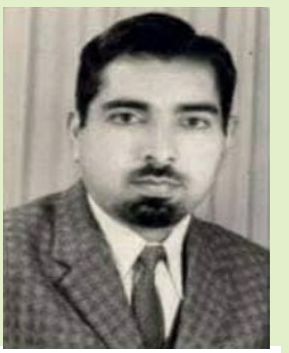

پروفیسر مبارک احمد انصاری صاحب

پروفیسر محمد اسلم صابر صاحب

15-دسمبر 2024ء کو مسی ساگا میں ''ٹکوسا'' کی جو تقریب منعقد ہوئی، اس میں ٹورانٹو میں موجود ٹی آئی کالج کے دو پرانے پروفیسر صاحبان نے بھی شرکت کر کے کالج سے متعلقہ اپنی یادیں و تاثرات بیان کئے - جنہیں ہال میں موجود سبھی پرانے « طلباء « نے بڑے انہماک و دلچسپی کے ساتھ سنا-

پروفیسر محمد اسلم صاحب صابر نے اپنی پرانی یادوں کو کریدتے ہوئے حاضرین کو بتایا کہ کس طرح وہ سرگودھا سے میٹرک پاس کر کے اپنے آبائی ضلع سیالکوٹ کے مرے کالج میں داخل ہونے جارہے تھے - راستے میں وہ بس سے اتر کر اپنے ایک دوست منیر احمد کو ملنے احمد نگر اتر گئے - جو ان دنوں جامعہ احمدیہ میں طالب علم تھا- وہ مجھے تعلیم الاسلام کالج ربوہ دکھانے سائیکل پر لے گیا - کالج نیا نیا تعمیر ہوا تھا - اتفاق سے پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد صاحب رح بھی اس وقت کالج کی نئی عمارت کا معائنہ کرنے وہاں موجود تھے - ان کیساتھ ملاقات میں میرے دوست منیر احمد نے بتایا کہ یہ لڑکا چک 37 جنوبی ضلع سرگودھا سے آیا ہے - اور اب واپس سیالکوٹ، مرے کالج میں داخل ہونے جارہا ہے -

آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا میٹرک میں نمبر کتنے ہیں ؟ میں نے عرض کیا جناب 707 نمبر زہیں -منیر احمد صاحب نے ساتھ ہی یہ گرہ بھی لگادی کہ میاں صاحب! یہ ضلع سرگودھا کے تمام سکولوں میں فرسٹ آیا ہے -

آپ رح نے فرمایا: یہاں کیوں نہیں داخل ہو جاتے !؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے پہلے علم نہیں کہ ربوہ میں بھی کالج کھل رہا ہے - دوسرا میرے پاس تو داخلے کیلئے سردست پیسے بھی نہیں ہیں -مسکراتے ہوئے فرمایا: کتنے پیسے ہیں اس وقت ؟ عرض کیا: بس کا کرایہ نکال کر صرف پانچ روپے زائد ہیں - آپ نے چوہدری محفوظ الرحمان صاحب کلرک جو پاس ہی کھڑے تھے، ان سے فرمایا کہ لڑکے سے پانچ روپے لو اور اسے کالج میں داخل کر لو - انہوں نے رسید کاٹ دی - اور اس طرح میں صرف پانچ دے کر کالجئیٹ بن گیا -

محترم پروفیسر اسلم صابر صاحب نے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب رح کے بطور پرنسپل، شفقتوں و عنایات کے متعدد اور بھی ایمان افروز واقعات حاضرین کو سنائے -

اسی طرح محترم پروفیس مبارک احمد صاحب انصاری بھی گزرے وقتوں کی سہانی یادوں میں سے ایک دلچسپ چشم دید واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ قادیان میں مجلس خدام الاحمدیہ کے اولین صدر تو مولوی قمرالدین صاحب تھے - ان کے بعد دوسرے صدر حضرت مرزا ناصر احمد رح مقرر ہوئے تھے - اس زمانہ میں آپ کی طبعیت میں قدرے سختی تھی - اور آپ کے ہاتھ میں بید کی چھڑی اکثر دیکھی جا سکتی تھی - جہاں کوئی خرابی دیکھتے، اس کی اصلاح بید کی ضربوں سے کر دیا کرتے ••••

ایک دفعہ ایک کشمیری نوجوان، جس کا نام عبدالعزیز عرف « جیجا کشمیری « تھا، اس کو سرعام سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ لیا - اس زمانے میں قادیان میں سرعام سگریٹ نوشی کو معیوب سمجھا جاتا تھا - اس نوجوان احمدی کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا تو کہا کہ سزا کیلئے ہاتھ باہر نکالو! تا کہ بید سے تمہیں سزا دوں - وہ لڑکا بہت ہوشیار تھا - کہنے لگا کہ مجھے سزا دینے سے پہلے میری ایک درخواست سن لیں - اس سے کہا کہ بولو کیا کہتے ہو !؟ لڑکا کہنے لگا کہ حضرت مرزا عزیز احمد صاحب یہاں سے گزرے تھے - اور انکے ہاتھ میں سگریٹ کا یہ ٹکڑا تھا - جب انہوں نے اسے پھینکا تو میں نے بطور « تبرک « سمجھ کر اٹھالیا اور وہی پی رہا تھا ••••

یہ سن کر حضرت میاں ناصر احمد رح کو اسکی ہوشیاری پر بے اختیار ہنسی آ گئی، اور انہوں نے جیجے کشمیری کو بغیر سزا دیئے جانا دیا - اور بھی کئی دلچسپ واقعات ہیں جو اس باغ و بہار انسان کی سیرت پر کماحقہ روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں - بس اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے -

پروفیسر مبارک احمد انساری صاحب اور مولانا مبشر احمد کاہلوں صاحب

تعلیم الاسلام کالج. ربوہ

ایم۔اے عربی کے اساتذہ وطلبہ۔حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمۃ اللہ علیہ اور پرنسپل کے ساتھ (اپریل 1966ء)

کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں) قریشی مقبول احمد، عطاء المجیب راشد، مولانا ابوالعطا جالندھری، سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمۃ اللہ علیہ، قاضی محمد اسلم ایم۔اے کینٹب (پرنسپل)، پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔اے، محمد اسلم صابر ایم۔اے، چوھدری سلطان اکبر ایم۔اے

بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں) سید عبدالحی، شیخ نذیر احمد، غلام احمد نسیم

تعلیم الاسلام کالج ۔۔۔۔۔ چند حقائق

پروفیسر محمد شریف خان، مرحوم ومغفور

بے نفسی اور ایثار سے سرشار اساتذہ نظام تعلیم الاسلام کے ساتھ شروع سے ہی وابستہ رہے۔ یہ مخلص وفا شعار بزرگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشاد کی تعمیل میں دیوانہ وار محض خدمت دین کی خاطر قادیان جیسی چھوٹی سی بستی میں سب کچھ تیاگ کر آئے، ان کی مسلمہ قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتیں ان کے راہِ وقف میں روک نہ بنیں اور قلیل سی تنخواہ (جسے عرف عام میں ''گزارہ'' کہا جاتا تھا) پر بخوشی بسر اوقات کرتے رہے، کئی ماہ جماعتی مالی مشکلات کے باعث تنخواہ کے بغیر لنگر خانے کے کھانے پر ہی گزر اوقات ہوتی۔ یہ فدائی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدموں میں رہ کر اس قومی تربیت گاہ کی خدمت کرنے کو ایک فخر وسعادت سمجھتے رہے۔ چنانچہ حضور نے ایک مکتوب میں فرمایا:

''یہ مدرسہ محض دینی اغراض کی وجہ سے۔ ہے اور صبر سے اس میں کام کرنے والے خدا تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہوتے جاتے ہیں''۔

(ذکر حبیبؑ مؤلفہ مفتی محمد صادق صاحبؓ صفحہ 137)

خالص دینی ماحول

مدرسہ تعلیم الاسلام اور اس کے تسلسل میں تعلیم الاسلام کالج قادیان، لاہور اور رہوہ بیسویں صدی میں اپنی نوعیت کے وہ منفرد ادارے تھے، جن کے اساتذہ اور طلباء کو مسیحِ زماں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے وقت کی تاثیرات قدسیہ کے طفیل ایک بے مثال روحانی اور مذہبی فضا میسر تھی۔ حضرت مولٰنا عبد الکریمؓ نے اخبار الحکم ۷/ فروری ۱۹۰۳ء میں تحریر فرمایا:

''ہمارے مدرسہ کے لڑکے خدا کے مسیح کو دیکھتے ہیں۔ آپ کی تقریروں کو سنتے ہیں۔ آپ کے پاک نمونہ کو مشاہدہ کرتے ہیں۔۔۔ ہر روز باقاعدہ عصر کے بعد لڑکے حضرت مولوی نورالدینؓ کے درس قرآن مجید میں شامل ہونے کو عزت دیتے ہیں۔ یہ بھی ایسی نعمت ہے کوئی ملک اور شہر اس میں ہمارا شریک نہیں''۔ اور یہ سلسلہ ربوہ میں بھی جاری رہا۔

تعلیمی ریکارڈز

قادیان میں تعلیم الاسلام کالج کی افتتاحی تقریب کا اہتمام ۲۸/ مئی ۱۹۰۳ کو زیر صدارت حضرت مولانا نور الدین خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ منعقد ہوا۔ نواب محمد علی خان ڈائریکٹر کالج کمیٹی نے اپنے مختصر خطاب میں فرمایا ''خدا کی ذات سے بڑی امید ہے کہ یہ کالج بہت جلد ایک یونیورسٹی ہو گا اور اس احمدی جماعت کے لئے ایک مفید دار العلوم ناہو گا۔ یہ کالج خدا کے فضل سے چلے گا اور خدا کے صادق بندے مسیح موعود کی دعاؤں سے نشو ونما پائے گا''

جب کہ حضرت مولانا نور الدینؓ نے اپنے نہایت ایمان افروز صدارتی خطاب میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''۔۔۔علوم کی تحصیل آسان ہے مگر خدا کے فضل کی نیچے اسے تحصیل کرنا یہ مشکل ہے ۔۔۔تم بھی اللہ پر کامل یقین کرو اور دعاؤں کے ذریعے، جو کہ دنیا کی مخالفت میں سپر ہیں،، فضل چاہو۔ کتاب اللہ کو دستور العمل بناؤ تا کہ تم کو عزت حاصل ہو۔ باتوں سے نہیں بلکہ کاموں سے اپنے آپ کو اس کتاب کے تابع ثابت کرو۔ ہنسی، تمسخر، ٹھٹھا، ایذا، گالی یہ سب اس کتاب کے بر خلاف ہے۔ جھوٹ سے، لعنت سے تکلیف اور ایذا دینے سے ممانعت اور لغو سے بچنا اس کتاب کا ارشاد ہے۔ صوم اور صلوٰۃ اور ذکر شغل الٰہی کی پابندی اس کا اصول ہے''۔ (الحکم جون ۱۹۰۳)

کالج کے شاندار نتائج

کالج کے قیام کے دو سال بعد ۱۹۰۵ کے پنجاب یونیورسٹی کے ۵۳ فیصد نتیجہ کے مقابلے میں کالج کا نتیجہ ۷۵ فیصد رہا! جبکہ ارد گرد کے کالجوں کا نتیجہ ۵۰ فیصد تھا۔ اس شاندار نتیجہ نے قادیان میں کالج کے قیام کا جواز نہ صرف ثابت کر دیا بلکہ اس بات کو محکم کر دیا کہ دینی تعلیم کسی صورت بھی عام تعلیم کے حصول میں رکاوٹ نہیں، بلکہ یہ طلباء کے ذہن کو جلاء بخشتی ہے۔

۔۔۔ایم ایس سی تھے کہیں اور ملازم تھے، ثاقب صاحب کے ساتھ آملے۔ دعاؤں اور دونوں کی سخت محنت کے صلے میں بائی آلوجی کے ۱۹۶۰ء میں نتائج نہایت شاندار رہے: کالج کے بائی آلوجی کے طلباء نے یونیورسٹی کے امتحان میں پہلی، تیسری اور چوتھی پوزیشنز حاصل کر کے ریکارڈ قائم کر دیا، اور اُس سال اللہ کے فضل سے چھ طلباء کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا، الحمد للہ۔ شکور اسلم صاحب ایم ایس سی کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی چلے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں شعبہ بائی آلوجی میں بی ایس سی کی کلاسیں شروع ہوئیں۔ سید حبیب الرحمن صاحب ایم ایس سی باٹنی اور سید مقبول احمد صاحب ایم اس سی زوآلوجی شعبہ میں شامل ہوئے۔

۱۹۶۲ء میں شکور صاحب ایم ایس سی کر کے واپس آئے اور مقبول صاحب چلے گئے۔ستمبر ۱۹۶۳ء میں خاکسار (محمد شریف خان) نے ایم ایس ی، زوالوجی کرنے کے بعد نظارت تعلیم میں حاضری دی، اور کالج میں لیکچرر زوالوجی تعینات ہوا۔ اور اس طرح پہلی بار شعبہ ہائی آلوجی میں باٹنی کے دو اور زوالوجی میں ایک پروفیسر کے ہونے سے سٹاف مکمل ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی کی انسپکشن ٹیم کی کالج میں آمد

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر مظفر احمد صاحب صدر شعبہ زوالوجی پنجاب یونیورسٹی، کالج کے شعبہ ہائی آلوجی میں بی ایس سی کلاسوں کے لئے مہیا سہولتوں کے معاینہ (In-spection) کے سلسلے میں تشریف لائے، موصوف یونیورسٹی میں میرے پروفیسر اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ میں نے جو کالج میں اپنا ریسرچ سیٹ اپ بنایا تھا، اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "تم نے تو جنگل میں منگل بنا دیا ہے"۔ ان ریمارکس کا پس منظر یہ تھا:

ایم ایس سی فائنل میں میری فرسٹ پوزیشن تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے دفتر میں بلایا، اور مبارک باد دی اور پوچھا تمہارا اب کیا ارادہ ہے۔ انہیں پتہ تھا میں احمد کی ہوں۔ میں نے بتایا میں واقف زندگی ہوں، جماعت کی طرف سے ہدایت ہے میں ایم ایس سی کے بعد تعلیم الاسلام کالج کا حصہ بنوں۔ کہنے لگے "ربوہ، جہاں سوکھی پہاڑیوں کے سوا کچھ نہیں، نہ کوئی لیبارٹری اور لائبریری، وہاں جا کر اپنے آپ کو ضائع کر دو گے۔ میرے پاس ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر کی جگہ خالی ہے، اگر کہتے ہو تمہارا نام یونیورسٹی کو ریکومنڈ کر کے بھیج دیتا ہوں، یہاں رہو گے ریسرچ کے مواقع ہیں، ایک سال میں وظیفہ پر باہر جا کر پی ایچ ڈی کر آؤ گے"۔ خود ڈاکٹر موصوف کا ریسرچ میں ایک نام تھا، انہیں مجھے ربوہ میں ریسرچ میں مشغول دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا۔ ڈاکٹر صاحب "پاکستان جرنل آف زوآلوجی" کے ایڈیٹر تھے، جس میں میرے اس وقت تک ایک دو مقالہ چھپ چکے تھے۔موصوف اکثر اپنے شاگردوں کو میری مثال دے ریسرچ کے لئے مستعد کرتے رہتے تھے۔

اپنے وقف کے عہد سے وفا کی برکت سے مجھے اسی ربوہ شہر میں جسے میرے فاضل استاد بے آب و گیا کہتے تھے، ایک ایسے اہم فیلڈ ریسرچ کرنے کا موقعہ ملا جس میں پاکستان بھر میں کوئی ریسرچ کا ریکارڈ نہیں تھا۔ اور مجھے وہ سب کچھ مہیا کر دیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ الحمد للہ جب ۱۹۶۵ء میں شکور اسلم صاحب سیرالیون جماعت کے کسی ادارے میں پڑھانے چلے گئے، تو پروفیسر صادق علی صاحب پشاور یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کر کے شعبہ ہائی آلوجی میں متعین ہوئے۔

۱۹۷۴ء ۔ نیشنلائزیشن کے وقت ہم تینوں (حبیب الرحمن، محمد شریف خان اور چوہدری صادق علی) شعبے کو چلا رہے تھے۔حبیب صاحب جلد ہی شیخوپورہ ٹرانسفر ہو گئے، جبکہ خاکسار تمبر ۱۹۹۹ء میں ریٹائر ہو کر امریکہ میں بچوں کے پاس آ گیا اور صادق صاحب ریٹائرمنٹ کی زندگی آسٹریلیا میں گزار رہے تھے کہ کچھ سال ہوئے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہائی آلوجی سوسائٹی

تعلیم الاسلام کالج پاکستان کا وہ واحد تعلیمی ادارہ تھا جہاں ہر طریق سے طلباء میں خود اعتمادی اور علم سے شغف پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کالج میں الیکشن کمشن مقرر تھا جو الیکشن کی تواریخ کا اعلان کرتا، اور ساری سرگرمیوں پر نظر رکھتا، شکایات کا فوری ازالہ کرتا۔ چنانچہ کالج یونین (قائد اعظم سوسائٹی) جس کے انتخابات اور سرگرمیوں میں بلا تمیز سال و مضمون کالج کا ہر طالب علم حصہ لے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر مضمون کی اپنی سوسائٹی تھی، کالج میں سالانہ داخلوں کے معابعد تاریخوں کا اعلان ہو جاتا، اور اساتذہ سے الیکشن کمشنر مقرر ہوتے۔ شریفانہ دھوم دھام سے الیکشن ہوتے، انتخابی تقاریر میں امید واران اپنا منشور پیش کرتے۔ ہر طالب علم کو ووٹ کا حق تھا۔ ووٹنگ اساتذہ کی نگرانی میں ہوتی۔ امید واران کی موجودگی میں ووٹ کاؤنٹ ہوتے۔ بغیر کسی اختلاف کے سارا سال سوسائٹیاں کام کرتیں اور طلباء غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ نصابی سرگرمیوں میں دلجمعی سے حصہ لیتے۔ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں کالج کے نتائج اردگرد کے کالجوں سے کئی فیصد اچھے رہتے۔

کالج میں انتخابات کس نہج پر ہوتے ہائی آلوجی سوسائٹی کی مثال سے واضح کرتا ہوں: جوں ہی نئے آنے والے فرسٹ ایئر کے طلباء کالج کے ماحول میں سیٹل ہو جاتے، الیکشن کمشن انتخاب کی تاریخ کا اعلان کر دیتا۔سوسائٹی کا صدر اور نائب صدر فورتھ اور تھرڈ ایئر سے جبکہ سیکریٹری اور نائب سیکریٹری کے سیکنڈ اور فرسٹ ایئر سے نام طلب کئے جاتے۔ مجلس کے ماہانہ اجلاسات میں طلباء ذوق و شوق سے ہائی آلوجی سے متعلق موضوعات پر مضامین پیش کرتے، اچھے معلوماتی مقالات کالج میگزین المنار میں راہ پاتے۔ ہر ہفتہ پندرہ دن میں دریا کی سیر ہوتی، جہاں کشتی رانی۔ اور سوسائٹی کے اجلاس کے علاوہ طلباء دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ لمبی سیر کے دوران جانور اور پودے اکٹھے کر کے لاتے جو کالج کے میوزیم کی زینت بنتے۔

سال کے دوران موسم بہار کی چھٹیوں میں نسبتاً نزدیک کے علاقوں: مری، سون سکیسر ویلی وغیرہ، جبکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں دور افتادہ شمالی پہاڑی علاقوں: سوات کاغان وغیرہ کا ہفتے، دو ہفتے کے لئے ہائی آلوجی سوسائٹی کے زیر انتظام جنگلی حیات کے

مطالعہ کے سلسلے میں کسی استاد کی نگرانی میں سالانہ تعلیمی سفر ہوتا، جس کا آدھا خرچ کالج بر داشت کرتا، باقی طالب علم ۔ ان سفروں کے دوران اکٹھے کئے گئے جانور کالج بائی آلوجی میوزیم اور ہر بیریم (Herbarium) کا حصہ بنتے۔ان کوششوں کے باعث کالج کا میوزیم علاقے کے تمام کالجوں سے بڑا اور مترتب تھا۔

تعلیم الاسلام کالج نیو کیمپس
تاریخی پس منظر

۲۸ مئی ۱۹۰۳ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کے کالج میں اپ گریڈ ہو نے کے دن افتاحی تقریب کا انعقاد ہوا، نواب محمد علی خان صاحب ڈائریکٹر کالج کمیٹی نے اپنے خطاب میں فرمایا:

’’خدا کی ذات سے بڑی امید ہے کہ یہ کالج بہت جلد ایک یونیورسٹی ہو گا اور اس احمدی جماعت کے لئے ایک مفید دارالعلوم ثابت ہو گا۔ یہ کالج خدا کے فضل سے چلے گا اور خدا کے صادق بندے مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں سے نشو ونما پائے گا۔‘‘

پھر حضرت مصلح موعودؓ نے ۴ جون ۱۹۴۴ء کو تعلیم الاسلام کالج کے قادیان میں دوبارہ اجراء کی افتتاحی تقریب کے موقع پر خطاب کے آخر میں فرمایا:

’’اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیک خواہشات کو پورا فرمائے۔ اور یہ بیج جو آج اس مقام پر ہم بو رہے ہیں اس سے ایک دن ایسا درخت پیدا ہو جس کی ایک ایک ٹہنی ایک بڑی یونیورسٹی ہو، اور ایک ایک پتہ کالج بن جائے۔ اور ایک ایک پھول اشاعت اسلام اور اور تبلیغ دین کی ایک اعلیٰ درجہ کی بنیاد ہو جس کے ذریعہ کفر اور بدعت دنیا سے مٹ جائے اور اسلام اور احمدیت کی صداقت اور خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ آمین ثم آمین۔‘‘

حضرت مصلح موعودؓ نے ۲۶/ جون ۱۹۵۳ء کی شام لاہور سے تشریف لا کر ربوہ میں کالج اور ہوسٹل کی عمارات کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور ربوہ میں کالج کے افتتاح کے موقعہ پر ۶/ دسمبر ۱۹۵۴ء کو اپنے ولولہ انگیز خطاب کے آخر میں حضور نے دعا کروائی:

’’اللہ تعالیٰ اس کالج کو اس مقصد کو پورا کرنے والا بنائے جس کے لئے اسے قائم کیا گیا ہے اور اس کے طالبعلم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہوں جو لوگوں کو آپ کا صحیح چہرہ دکھانے میں کامیاب ہوں۔‘‘

ان دعاؤں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے کالج ربوہ میں ترقیات کی منازل طے کرتا ہوا پوسٹ گریجوایٹ کے درجے تک پہنچا اور ایم اے عربی کی کلاسیں جاری ہوئیں۔ جب ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں محکمانہ طور پر ڈگری اور انٹرمیڈیٹ کلاسوں کو الگ کرنے کی تجویز ہوئی۔ کالج کی عمارت پہلے ہی انٹر اور ڈگری کلاسوں کے لئے چھوٹی پڑ رہی تھی، چہ جائیکہ پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں کی متحمل ہوسکتی۔ کالج کی غربی جانب تقریباً ایک میل دور دریا کے کنارے زمین کے ایک وسیع قطعے پر پوسٹ گریجوایٹ کیمپس (یونیورسٹی کی تعمیر شروع ہوئی۔ جہاں فزکس ونگ کی تیاری کے ساتھ ہی ایم ایس سی کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔ کیمسٹری ونگ تقریباً مکمل تھا، ضروری فٹنگ کا انتظام کیا جارہا تھا۔ باٹنی، زوالوجی ونگز کی چھتیں مکمل تھیں پارٹیشن کی تعمیر شروع ہوا ہی چاہتی تھی کہ ۱۹۷۳ء میں نیشنلائیزنگ کے عفریت نے پاکستان کے تعلیمی نظام پر اپنے خونی پنجے گاڑ لیے، اور سب تعلیمی توسیع کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بُرا ہو غلط سوچ اور تعصب کا۔عدم توجہی کی وجہ سے یہ عظیم عمارت آہستہ آہستہ شکست وریخت کا شکار ہو رہی ہے۔

ربوہ اور پاکستان بھر میں نئے تعلیم الاسلام تعلیمی ادارے

خدائی تحریکات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا عجیب سلوک دیکھا گیا ہے۔ جب کوئی منصوبہ دعاؤں کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے، دنیاوی روکوں کے باوجود نئے عصری تقاضوں کے مطابق وہی منصوبہ نئی ترقیات کے ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔ آج سے ۳۰۔ ۳۲ سال پہلے ربوہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے فقط ایک ایک ہائی سکول اور کالج تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ربوہ میں اسکول لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ۲ کالج ، ایک کامرس ڈگری کالج اور مدرسۃ الحافظ قائم ہیں۔ ان اداروں میں ڈبل شفٹ جاری ہے: صبح کی شفٹ لڑکیوں اور شام کی شفٹ لڑکوں کے لئے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ربوہ سے باہر مختلف علاقوں میں ۲۲ سکول طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔

وہ دعائیں اور زاریاں جو مدرسہ تعلیم الاسلام کے قیام کے وقت ۲۸ مئی ۱۹۰۳ء کو قادیان میں کی گئیں ان کی روشنی مسلسل جماعت کی رہنمائی کر رہی ہے۔ نباض وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مسلمانوں کو علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کی نہ صرف تاکید فرمائی بلکہ ان علماء کی اس فاش غلطی کہ علوم جدیدیہ کو حاصل کرنا خلاف اسلام اور گمراہی کی جڑ ہے کے خلاف مسلمانوں کو جھنجوڑا۔ اور توجہ دلائی کہ اس خطرناک خیال نے کس طرح مسلمانوں کو ہندوستان میں بسنے والی دوسری اقوام کے مقابل ترقی کی دوڑ میں پیچھے رکھا ہے۔حضور نے اسوقت بالخصوص احمدیوں کو علوم جدیدہ حاصل کرنے کی مندرجہ ذیل پر زور الفاظ میں تاکید فرمائی:۔

’’ میں ان مسلمانوں کو غلطی پر جانتا ہوں جو علوم جدیدہ کے مخالف ہیں۔ وہ

دراصل اپنی غلطی اور کمزوری کو چھپانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ علوم جدیدہ کی تحقیقات اسلام سے بدظن کر دیتی ہے اور وہ یہ قرار دیے بیٹھے ہیں کہ گویا عقل اور سائنس اسلام سے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ کیونکہ خود فلسفہ کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لئے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ بات تراشتے ہیں کہ علوم جدیدہ کا پڑھنا ہی جائز نہیں۔ ان کی روح فلسفہ سے کانپتی ہے اور نئی تحقیقات کے سامنے سجدہ کرتی ہے۔"

(ملفوظات جلد اول صفحہ ۴۳)

اب اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے نتائج دیکھنے کا وہ سنہری دور آ گیا ہے جس کے دوران حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قائم کردہ "مدرسہ تعلیم الاسلام" کی روشنی بر صغیر پاک و ہند سے نکل کر نائیجیریا، سیرالیون اور گھانا وغیرہ میں ضوفشاں ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

جماعت احمدیہ کی صداقت تعلیم الاسلام کالج

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام ذکر اور فکر کے بارہ میں فرماتے ہیں: قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور اسکی قدرتوں میں فکر کرتے ہیں ذکر اور فکر ہر دو عبادت میں شامل ہیں فکر کے ساتھ شکر گزاری کا مادہ بڑھتا ہے انسان سوچے اور غور کرے کہ زمین اور آسمان۔ ہوا اور بادل۔ سورج اور چاند ستارے اور سیارے سب انسان کے فائدے کے واسطے خدا تعالیٰ نے بنائے ہیں فکر معرفت کو بڑھاتا ہے۔

(ملفوظات جلد نہم صفحہ ۳۲۱)

۱۹۰۵ میں کالج کی عارضی بندش اور ۱۹۴۴ء میں دوبارہ اجراء

یونیورسٹی کی شرائط پوری نہ کر سکنے پر، باوجود شاندار نتائج کے کالج کو ۱۹۰۵ء میں مجبوراً بند کرنا پڑا۔ ۱۹۴۴ء میں شرائط کے مطابق قادیان میں کالج کا دوبارہ افتتاح ہوا۔

ہجرت سے قبل اور بعد (قادیان، لاہور اور ربوہ) کے دوران میں تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ اور طلباء کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں حضرت مرزا ناصر احمد ایم اے آکسن جیسی تاریخ ساز ہستی کی پرنسپل شپ اور راہنمائی میں شاندار ترقیات حاصل کرنے کے مواقع حاصل رہے۔ تاریخ احمدیت جلد ۹ کے اوراق کالج کے ان شاندار ریکارڈز کے امین ہیں۔ یہاں شاندار تعلیمی ریکارڈز کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

سال	نام طالب علم	امتحان	یونیورسٹی میں پوزیشن
1946-1945 (قادیان)	نذیر احمد	ایف۔اے	سوم
1952-1951 (لاہور)	مرزا بشارت احمد	بی ایس سی	سوم
1954-1953 (ربوہ)	حمید اللہ	بی ایس سی	دوم
1956-1955	منور احمد سعید، اعجاز الرحمٰن	ایف۔اے بی ایس سی	اول سوم
1958-1957	محمد سلطان اکبر، افتخار احمد شہاب	بی اے عربی آنرز بی اے انگریزی	اول اول
1961-1960	حمید احمد خان قریشی اعجاز الحق سید امین	ایف ایس سی پری میڈیکل ایف اے آرٹس بی ایس سی فزکس	اول اول اول
1963-1962	قریشی اعجاز الحق	بی اے	اول

1964-1963	چوہدری محمد صدیق	ایم اے عربی سال اول	اول
	چوہدری ناصر الدین	ایم اے عربی سال اول	دوم
	بشارت الرحمٰن	ایم اے عربی سال اول	دوم
	عطاء المجیب راشد	بی اے سال دوم عربی	اول
	قریشی اعجاز الحق	بی اے سال دوم ہسٹری آنرز	اول
1965-1964	چوہدری محمد صدیق	ایم اے عربی	اول
1966-1965	قریشی مقبول احمد	ایم اے عربی	اول
	عطاء المجیب راشد	ایم اے عربی	دوم
	سید عبدالحی	ایم اے عربی	سوم
	عنایت اللہ منگلا	ایم اے اقتصادیات	اول

یہ شاندار نتائج تعلیم الاسلام کالج کے پرسکون تعلیمی ماحول، بیدار مغزی اور اساتذہ کی نیک نیتی، محنت، خلوص اور کالج میں تعلیمی گہما گہمی اور تسلسل کے غماز ہیں۔

شعبہ بائی آلوجی

تحدیث نعمت میں اپنے شعبہ بائی آلوجی کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۹۴۴ء قادیان میں تعلیم الاسلام کالج کے اجراء کے وقت آرٹس اور سائنس بہ شمول فزکس، کیمسٹری اور بائی آلوجی کے شعبہ جات قائم ہو چکے تھے۔

منتظم کار کن (سٹاف) اور تجربہ گاہیں (لیبارٹریز) مہیا تھیں۔طلباء میں تقریر و تحریر کا ملکہ پیدا کرنے کے لئے مختلف انجمنوں (سوسائٹیوں) کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملکی تقسیم کے بعد لاہور میں بھی مندرجہ بالا شعبہ جات جاری رہے۔ لیبارٹریز اور اساتذہ کی کمی ایف سی اور دیال سنگھ کالجوں کی انتظامیہ کے تعاون سے پوری کی جاتی رہی۔ کالج میگزین «المنار» کا اجراء ہوا۔ لاہور میں چند سالہ قیام کے دوران نتائج اور کھیلوں کے میدان میں تعلیم الاسلام کالج پنجاب بھر میں منفرد مقام حاصل کر چکا تھا۔

وقت کے ملکی اور لاہور کے ناسازگار حالات کے باعث کالج انتظامیہ کی ساری توجہ ربوہ میں کالج کی عمارت کی تکمیل اور کالج منتقل کرنے کے معاملات پر مرکوز رہی۔

تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں

ربوہ میں کالج کی شاندار عمارت آرٹس، فزکس، کیمسٹری اور بائی آلوجی کے ونگز پر مشتمل تھی۔ تمام شعبہ جات میں بی اے، اور بی ایس سی کی کلاسیں بڑی کامیابی سے جاری تھیں۔ البتہ شعبہ بائی آلوجی میں ایف ایس سی تک کلاسیں تھی بی ایس سی میں باٹنی اور زوالوجی کی کلاسیں شروع کرنے میں اساتذہ کی کمی کا مسئلہ ۱۹۶۳ تک رہا۔ بائی آلوجی لیبارٹری میں ہیں تیں اعلیٰ کوالٹی کی قیمتی لیسٹر برانڈ کی مختلف اقسام کی خوردبینیں، وسیع عجائب گھر، پروفیسر روم اور لیکچر تھیٹر مہیا تھا۔ لیبارٹری سٹاف میں مکرم مطیع اللہ خان صاحب، محمد شریف احمد نگری مرحوم اور لعل دین مرحوم اور مجید احمد جیسے مستقل مستعد کار کن تھے۔ لاہور میں محمود احمد صاحب حیدرآبادی بائی آلوجی پڑھاتے رہے۔

شعبہ بائی آلوجی میں مشکلات

۵۵-۱۹۵۴ ربوہ منتقلی کے بعد بائی آلوجی کے شعبے میں کالج پراسپیکٹس میں صاحبزادہ ڈاکٹر مرزا منور احمد کا نام پروفیسر کے طور پر درج تھا، مرحوم ڈاکٹر صاحب اور مکرم ڈاکٹر عبد الشکور غنی صاحب (برادر خورد پروفیسر عبدالرشید غنی صاحب، جو ایف ایس سی کا امتحان دے کر فارغ تھے) کچھ عرصہ بائی آلوجی کی کلاسیں لیتے رہے۔ جلد ہی مکرم شکور اسلم صاحب بی ایس سی اور ہائی سکول سے ماسٹر منظور احمد صاحب نے اس شعبہ کو کچھ عرصے تک سنبھالا دیا۔ ان کے بعد ۱۹۵۸۵۶ کے دوران مرحوم نصیر احمد بشیر صاحب ایم ایس سی زوالوجی (گولڈ میڈلسٹ) شعبہ کے انچارج بنے۔ ان کے جانے کے بعد پھر مسئلہ ہوا، تو ۱۹۵۹ء میں مکرم پروفیسر رفیق احمد صاحب ثاقب (ایم ایس سی آنرز کیمسٹری) کو شعبہ بائی آلوجی کا ہیڈ مقرر کیا گیا، موصوف کے لئے بائی آلوجی کا مضمون نیا تھا۔ مگر ثاقب صاحب نے بڑی ہمت اور جانفشانی سے شعبہ کو چلایا۔ اکثر ثاقب صاحب کی مدد کے لئے مکرم مرزا منظور احمد صاحب پروفیسر بائی آلوجی گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد موسم سرما کی چھٹیوں میں ربوہ آتے۔ عام دنوں میں ثاقب

صاحب بڑی ہمت سے ادھر اُدھر سے (کمانڈر لطیف صاحب فیصل آباد وغیرہ سے مدد لے کر شعبہ کو چلاتے رہے، اور ساتھ خود بھی ایف ایس سی بائی آلوجی کے امتحان کی تیاری کرتے رہے، اور امتحان نمایاں پوزیشن میں پاس کر لیا۔

ان کوششوں کے ساتھ ساتھ بزرگان کی دعائیں بھی تھیں۔ جب ثاقب صاحب نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے دعا کی درخواست کی اور راہنمائی چاہی تو میاں صاحب نے دعا کا وعدہ کیا اور یہ کہہ کر ہمت بندھائی:

''فکر نہ کریں، آپ کا اس مضمون میں ذہنی لیول اور سٹوڈنٹس کا لیول ایک ہے۔ آپ ان کی مشکلات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور انہیں بہتر طریق پر سمجھا سکیں گے۔''

ایک لاہوری مولوی صاحب میٹرو بس پر اچھرہ سے شاہدرہ جا رہے تھے۔
اگلی سیٹ پر ایک عورت بار بار اپنے بچے سے کہہ رہی تھی،
''بیٹا! یہ سوہن حلوہ کھالو، ورنہ میں ان مولوی انکل کو دے دوں گی''۔
جب خاتون نے چوتھی مرتبہ یہی کہا تو مولوی صاحب بولے،
''بہن جی! جلد فیصلہ کرلو!! آپ کی وجہ سے میں پہلے ہی 4 سٹاپ آگے آ چکا ہوں''۔

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب رحمہ اللہ کے مزاج کی ایک حسین مثال

حضرت مرزا ناصر احمدؒ کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا مزاح تھا۔ چہرہ پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی مگر مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تو چہرہ پر سنجیدگی چھا جاتی لیکن باتوں میں ملائمت کا احساس ضرور موجود رہتا۔ ہاسٹل کے سالانہ فنکشن میں تو سب اساتذہ ہی طلباء کی کڑوی کسیلی باتوں کا ہدف بنتے تھے مگر پرنسپل صاحب کی شخصیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی لاڈلی کار کو نشانہ تضحیک و تمسخر بنایا جاتا تھا۔ ایک بار وہ لاڈلی کچھ زیادہ ہی تمسخر کا نشانہ بنی تو چوہدری محمد علی صاحب نے پابندی لگا دی کہ اگلے فنکشن میں کوئی پرنسپل صاحب کی کار کے بارہ میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالے گا۔ میاں صاحب کو اس پابندی کا پتہ چلا تو کہلا بھیجا کہ اگر "میری لاڈلے" کو نظر انداز کر دیا گیا تو میں فنکشن میں آنے سے انکار کر دوں گا۔

آپؒ خود پڑھنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے اس لئے طالب علم آپ کی سزا بھی خندہ پیشانی سے جھیل جاتے تھے۔ اور یہ کہ جو طالب علم آپؒ کے ہاتھوں بیوزنی کا ہدف بنا وہ جب تک کالج میں رہا آپؒ کی بے پناہ شفقت اور محبت کا مورد رہا۔ ہمارا ایک دوست جو رونگ کا کیپٹن تھا کہا کرتا تھا یار ہم بھی کہیں دو چار بید میاں صاحب سے کھا لیتے تو باقی عمر چین سے گزرتی۔

حضورؒ کا سب سے بڑا کارنامہ کالج کو پوسٹ گریجویٹ لیول تک لانے کا ہے۔ اس زمانہ میں دینے کا حق ہونا چاہئے تھا مگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد عموماً اور محکمہ تعلیم کے حکام خصوصاً اس بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھے۔ یونیورسٹی کو بالآخر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ مفصل کالجوں میں تعلیم الاسلام کالج پہلا کالج تھا جسے ایم اے عربی کی کلاسیں شروع کرنے کی اجازت ملی۔ یونیورسٹی کی طرف سے اس سلسلہ میں جائزہ کے لئے جو کمیشن آیا اس نے جو رپورٹ یونیورسٹی کو بھیجی اس میں ربوہ کو مرکز علم قرار دیا گیا تھا۔ کمیشن میں شامل ڈاکٹر شفیع صاحب نے بعد میں ایک بار مجھ سے فرمایا کہ اگر ربوہ میں ایم اے عربی کی کلاسیں شروع نہیں کی جا سکتیں تو پاکستان کا کوئی اور شہر اس کا مستحق نہیں۔

ایم اے عربی کی کلاسیں شروع ہوئیں تو نتائج دیدنی تھے۔ اول دوم اور سوم آنے والے طلبا ہمارے ہی کالج کے ہوتے تھے۔ یہی حال فزکس میں پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں کا تھا۔ ایک بار کلاسیں شروع ہوگئیں تو M.Sc فزکس کے نتائج حیران کن حد تک لوگوں کو چونکا دینے والے تھے۔ چنانچہ آپؒ نے اپنی زندگی میں اپنے اور حضرت مصلح موعودؓ کے اس خواب کو پورا ہوتے دیکھ لیا جو خواب اس کالج کے افتتاح کے موقع پر دیکھا گیا تھا۔

بیان امام جماعت احمدیہ

ہر احمدی کو مسلم لیگ کی تائید کرنی چاہیے

حضرت مرزا بشیر الدین محمود امام جماعت احمدیہ نے 22 اکتوبر 1945 کو ایک مفصل مضمون میں اعلان کر دیا کہ "آئندہ الیکشنوں میں ہر احمدی کو مسلم لیگ کی تائید کرنی چاہیے تا انتخابات کے بعد مسلم لیگ بلا خوف تردید کانگرس سے یہ کہہ سکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے اگر ہم اور دوسرے مسلمان جماعتیں ایسا نہ کریں گی تو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کمزور ہو جائے گی اور ہندوستان کے آئندہ نظام میں ان کی آواز بے اثر ثابت ہوگی اور ایسا سیاسی اور اقتصادی دھکا مسلمانوں کو لگے گا کہ چالیس پچاس سال تک انکا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقل مند اس حالت کی ذمہ داری اپنے پر لینے کو تیار ہو۔ (الفضل 26 اکتوبر 1945 صفحہ 1)

تاریخی تصویر 1964ء تعلیم الاسلام کالج ربوہ - اساتذہ و طلباء پہلی و دوسری ایم۔اے عربی کلاس جناب پرنسپل صاحب کے ہمراہ

کرسیوں پر (دائیں سے بائیں): بشارت الرحمٰن (فاضل)، ناصر الدین (فاضل)، محمد اسلم صابر (ایم اے)، مولانا ارجمند خان (فاضل)، پرنسپل مرزا ناصر احمد صاحب (ایم اے آکسن) پروفیسر بشارت الرحمٰن (ایم اے)، محمد سلطان اکبر (ایم اے)، مولوی محمد صدیق (فاضل)، حسن محمد عارف (فاضل)

کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں): شیخ نذیر احمد (سال اول)، ریاض احمد (فاضل)، محمد اقبال (فاضل)، عبدالرشید ملک (سال اول)، سراج الحق قریشی (فاضل)، عطاء المجیب راشد (سال اول) شریف احمد (سال اول)، حمید احمد خالد (فاضل)

تعلیم الاسلام کالج میری درسگاہ

عبدالحئی بشارت

تعلیم الاسلام کالج میری تربیت گاہ ہی نہیں تھا میرا دوسرا گھر بھی تھا۔ طالب علمی کے دور میں جو 1965 سے 1969 تک محیط تھا، سے جو تدریسی عمل -1973 1974 تک میرا بہت سا وقت اسی دانش کدے کی خوبصورت عمارت کی پناہوں میں گذرا۔ میرے خاندان نے کالج میں میرے داخلے کے موقعہ پر لاہور سے ربوہ نقل مکانی کی تھی۔ بعد میں میرے والد سے لاہور ہی میں فوج سے ریٹائر ہوئے اور ربوہ میں وکالت مال ثانی میں اپنی خدمات پیش کیں۔ میں 1965 میں کالج میں داخل ہوا اور گریجوایشن کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے نفسیات میں داخلہ لیا۔ تعلیم الاسلام کالج میں پڑھائی کے دوران ایک سال کالج کے میگزین المنار اردو سیکشن کی ادارت کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ محترم چوہدری شریف خالد مرحوم اس وقت المنار کے نگران تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات میں ایم اے کرنے کے بعد ڈیڑھ سال تک تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی اور فلسفہ پڑھانے کا موقعہ ملا۔ اس وقت چوہدری محمد علی مرحوم پرنسپل تھے۔ مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے کہ میں نے تعلیم الاسلام کالج سے تعلیم حاصل کی اور وہاں طلباء کو پڑھایا بھی۔ اس دور میں ہمارا کالج پاکستان کے بہترین کالجوں میں سے ایک ایسا کالج تھا جہاں ادبی سرگرمیاں ہی نہیں مختلف کھیلوں کے قومی ٹورنامنٹس بھی ہوتے تھے اور سارے ملک سے بڑی بڑی ٹیمیں یہاں کھیلنے آتی تھیں۔ خصوصی طور پر ہمارے کالج میں باسکٹ بال، کبڈی، اور کشتی رانی کے ٹورنامنٹس کا انعقاد ہوتا تھا اور سارے ملک سے پروفیشنل ٹیمیں حصہ لیتی تھیں۔ ادبی سرگرمیوں کے بانی محترم پروفیسر ناصر احمد پرویز پروازی مرحوم ہوا کرتے تھے۔ اس دور کے نامور ادیب اور شعراء کالج میں کانفرنسوں اور مشاعروں میں آیا کرتے تھے۔ وہ ایک بہترین دور تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ میری کتابیں پڑھنے کی عادت میں کن کن ہستیوں کا دخل ہے تو ان میں ہمارے کالج کے لائبریرین محترم چوہدری محفوظ الرحمٰن مرحوم کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جب بھی سر راہے محلہ میں یا کالج میں مل جاتے تو لازماً پوچھتے کہ کیوں بھئی بڑے دنوں سے میں نے تمہیں لائبریری میں نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے آج کل کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں کل تم لازماً لائبریری آنا۔ اور پھر اگلے روز ہی میں لائبریری جا پہنچتا۔ ایک کتاب انگریزی کی اور ایک کتاب اردو کی ملتی تھی۔ اس طرح معمول کے مطابق وہ کتابیں ہفتہ میں پڑھ کر واپس کرتا اور دو اور لے آتا۔ یہ سلسلہ چوہدری صاحب مرحوم نے ٹوٹنے نہیں دیا۔ بس وہ چسکا ایسا پڑا کہ کتاب سے دوستی کر لی۔ کتابیں پڑھنے کا شغف ساری عمر رہا۔ میں جہاں بھی گیا میری لائبریری میرے ساتھ رہی۔ میری ذاتی لائبریری اس بات کی گواہ ہے۔ شعر و شاعری اور نثر نگاری میں کوئی میرا بڑا محسن ہے تو وہ پروازی صاحب ہیں۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے اور مجھ پر بھی ان کی کرم فرمائی غیر معمولی تھی۔ تادم وفات انکی محبت اور شفقت کبھی بھولنے والی نہیں۔ محترم پروازی صاحب دو دو سو طالب علموں کی کلاس کو شعر و ادب ہی نہیں پڑھایا کرتے تھے بلکہ نظم و ضبط بھی سکھاتے۔ کیا مجال کہ اتنی بڑی کلاس میں کوئی طالبعلم غیر ضروری حرکت کر سکے۔ ان کا کالج کے بڑے ہال میں ہر طالبعلم کا ڈائریکٹ رابطہ ہوتا تھا۔ میر تقی میر، میر درد، سودا، آتش، مومن، غالب اور اقبال کی شاعری کیا پڑھائی کہ ہم آج بھی نہیں بھولے۔ ہر استاد کا اپنا لہجہ اور اپنا انداز۔ ہم نے پنجابی میں انگریزی پروفیسر چوہدری شریف خالد مرحوم سے، شیکسپیئرین انگریزی محترم مرزا خورشید احمد مرحوم سے اور انگریزی شاعری محترم چوہدری محمد علی صاحب مرحوم سے پڑھی اور سیکھی۔ کالج کی دو دنیائیں تھیں ایک آرٹس کی اور دوسری سائنس کی۔ ہر استاد اپنے رنگ میں سقراط و بقراط سے کم نہ تھا۔ ہمارا کالج حضرت خلیفتہ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ کا ایک تحفہ تھا اور حضرت خلیفتہ المسیح الثالث رحم اللہ نے ایک لمبا سفر اس کی بنیاد سے لے کر پر رونق بننے تک طے کیا۔ اسکی شہرت ملک گیر ہی نہیں عالمگیر ہو گئی۔ تدریسی اداروں کو قومیا لینے کے بعد کالج کا معیار وہ نہ رہا مگر اس کی عظمت کے روشن دریچے ہم سب کے دلوں میں کھلے رہے اور آج بھی اس محبوب دانش کدہ کی روشنی سے ہمارے دل

منور ہیں۔ جرمنی سے سابق طلبائے تعلیم الاسلام کالج کی المنائی یا ایسوسی ایشن کے آغاز کا سہرا محترم چوہدری حمید احمد حمیدی صاحب کے سر ہے۔ ایک چراغ سے ایک اور چراغ لندن میں جلا اور پھر شمالی امریکہ میں امریکہ اور کینیڈا میں مشعلیں روشن ہوگئیں ۔ میں وہ دن دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہی مشعلیں ایک دن اتنی روشن ہو جائیں گی کہ ان ملکوں میں تعلیم الاسلام کالجوں کی درسگاہوں کی بنیاد بنیں گی۔ اس تنظیم پر ہمارے موجودہ امام حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی نظر ہے اور دعائیں ہیں۔ جو چراغ اس زمانے کے امام حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تعلیم الاسلام سکول کا جلایا تھا وہ روشن رہے گا۔ وہ دن دور نہیں جب لندن، جرمنی، شمالی امریکہ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں تعلیم و تربیت کی درسگاہیں اسی نام سے، تعلیم الاسلام کالج کے نام سے کھلیں گی، انشاء اللہ

تعلیم الاسلام کالج زندہ باد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعلیم الاسلام کالج زندہ باد

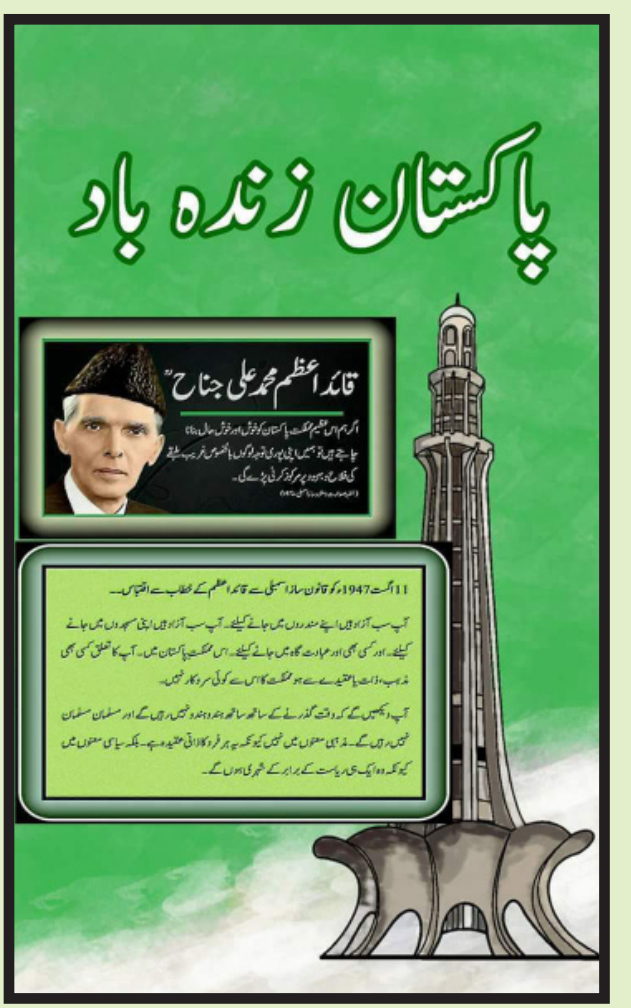

آنکھ ہے تو خواب ہونا چاہیے
خواب بھی نایاب ہونا چاہیے

وہ سمندر ہے اگر تو پھر مرے
پاؤں میں گرداب ہونا چاہیے

ٹھیک ہے ہم کو ڈوبو خود میں مگر
ہم کو زیرِ آب ہونا چاہیے

ہو تلاطم مثل اُس کا انتظار
سوچ میں سیلاب ہونا چاہیے

آدمی کے پاس اُس کا گھر بھی ہو
گھر میں بھی اسباب ہونا چاہیے

جستجو بینائی کی جاری رہے
حسن کو کمیاب ہونا چاہیے

ہو بشارتؔ چہرہ کتنا ہی اداس
دل مگر شاداب ہونا چاہئے

عبدالحئی بشارت

احمدیوں کی کتابیں دل پر اثر کرتی ہیں!!

مولوی عبدالقادر صاحب رائے پوری کے ملفوظات میں درج ہے کہ:

" مولوی احمد رضا خان صاحب (بریلوی) نے ایک دفعہ مرزائیوں کی کتابیں منگوائیں تھیں۔ اس غرض سے کہ ان کی تردید کرینگے۔ میں نے بھی دیکھیں۔ قلب پر اتنا اثر ہوا کہ اس طرف میلان ہوگیا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ سچے ہیں۔"

(سوانح مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری۔ مرتبہ: مولوی احمد علی صاحب لاہوری۔ صفحہ 42)

ہماری رائے:

یہی وجہ ہے کہ علماء۔۔۔ صاف دل لوگوں کو احمدیہ لٹریچر کے مطالعہ سے روکتے ہیں۔ اور احمدیوں کی باتیں سننے سے منع کرتے اور ان سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ کوئی ان سادہ مزاجوں سے پوچھے کہ کبھی تیزی سے بہتے پانیوں کو بھی روکا جا سکتا ہے!؟ سچ کہا ہے کسی نے کہ۔۔۔ ع

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

(مرسلہ: ابن احمد، ٹورانٹو)

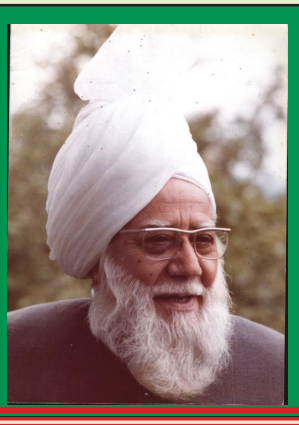

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ
ایک شفیق اور ڈسپلن کے پابند استاد!

(وقعات از: حیات ناصر)

حضرت مرزا ناصر احمد خلیفتہ المسیح الثالث رحمہ اللہ کی زندگی کا لمبا عرصہ درس و تدریس میں گزرا۔ جب آپ آکسفورڈ انگلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹے تو 1938ء کے نومبر میں حضرت خلیفتہ المسیح الثانی رض نے آپ کو جامعہ احمدیہ میں بطور استاد مقرر فرمایا۔ اور چار ماہ بعد ہی پرنسپل کے طور پر آپ کی تقرری ہوئی۔

اس کے بعد آپ 1944ء میں جب حضرت خلیفتہ المسیح الثانی رضی اللہ نے تعلیم الاسلام کالج کا اجراء فرمایا تو آپ رح کو اس کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ ان دونوں ادوار میں آپ رح کا اپنے طلباء سے محبت اور حسن سلوک اور طلباء کی آپ سے محبت اور عقیدت کی چند جھلکیاں پیش ہیں۔

جامعہ احمدیہ کے ایک طالب علم مولوی حکیم خورشید احمد صاحب مرحوم نے بیان کیا کہ ان کے والد کی وفات کے بعد تعلیم جاری رکھنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ تو آپ رح نے بغیر حکیم صاحب کو کچھ بتائے خود ہی انجمن احمدیہ سے آٹھ روپے وظیفہ مقرر کروا دیا۔ جو اس وقت کی ضرورت کیلئے کافی تھا۔ پھر آپ لکھتے ہیں کہ جب مولوی فاضل کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی کے حصول کیلئے سخت محنت کرنا پڑی تو میری صحت بہت گر گئی۔

مئی کے آخر میں ایک دن آپ رحمہ اللہ نے مجھے اپنی کوٹھی "النصرت" میں بلا کر کہا کہ:

"خورشید! میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری صحت بہت گر گئی ہے۔ ہم چند روز تک ڈلہوزی جا رہے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تمہاری صحت ٹھیک ہو جائیگی۔ جاؤ تیاری کرو۔"

ڈلہوزی میں ہم قریبا چار ماہ رہے۔ اس دروان حضور رح نے جامعہ کے تین استاد اور دو طلباء کو بھی سیر کیلئے بلایا۔ سب نے حضور رح کے مہمان خانہ میں پندرہ روز سے ایک ماہ تک قیام کیا۔ جی بھر کے سیر کی۔ جب آپ نے یہ محسوس کیا اب ڈلہوذی ان سب کے چہروں پر نمایاں نظر آنے لگی ہے تو انہیں جانے کی اجازت دی۔ میں نے اس دوران حضور رح کے چہرہء مبارک پر ایک خاص مسرت اور شگفتگی دیکھی۔

آپ رح اپنے مہمانوں کی خاطر داری صرف اپنے ملازموں پر ہی نہ چھوڑتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات کئی دفعہ کھانے کا ڈونگہ یا پھلوں کی ڈش وغیرہ آپ خود اٹھا کر ہمارے پاس لے آتے۔

میں نے اپنے ساتھ آپ کا اور بیگم صاحبہ کا سلوک بہت مشفقانہ دیکھا۔ آپ جو کھانا خود کھاتے وہی کھانا مجھے بھجواتے۔ بلکہ بیگم صاحبہ کے حکم پر دونوں وقت دودھ کی ایک پیالی اور کچھ پھل بھجوائے جاتے۔ اس دوران میری صحت کافی اچھی ہو گئی۔ اور انہیں دنوں میرا مولوی فاضل کا نتیجہ بھی آ گیا۔

اس دن سیر سے واپسی پر جب ہم حضور رح کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ہمارے انتظار میں تھے اور بہت مسرور تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا:

"میاں خورشید! مبارک ہو۔ آپ یونیورسٹی میں اول آئے ہیں۔ میرا پہلے ہی خیال تھا کہ آپ اس دفعہ یونیورسٹی میں Top پوزیشن حاصل کریں گے۔۔۔۔!"

میرے ساتھیوں نے کہا کہ ان پر مٹھائی واجب ہو گئی ہے۔ اس پر حضور رحمہ اللہ نے فرمایا: "ان کی مٹھائی میں کھلاوں گا۔"

پھر ایک دو دن بعد کے بعد اپنی کوٹھی میں ایک شاندار دعوت دی۔ جس میں حضرت اقدس خلیفتہ المسیح الثانی رض اور جملہ احمدی احباب جو ڈلہوزی آئے ہوئے تھے وہ بھی بلائے گئے۔

مکرم و محترم (بریگیڈیئر) وقیع الزمان خان صاحب اپنا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں

کہ ایک پروفیسر صاحب مجھے پسند نہ فرماتے تھے ۔ ایک امتحان کے بعد انہوں نے میرا پرچہ لیا اور میرے جوابات کو تضحیک کے انداز میں کلاس کے سامنے پڑھ پڑھ کر سنانا شروع کر دیا ۔ مجھے ناگوار خاطر گزرا ۔ اور انکے روکنے کے باوجود کلاس سے باہر چلا گیا۔

انہوں نے میری شکایت حضور رحمہ اللہ سے کر دی ۔حضور رحمہ اللہ کو میرے جواب سے تسلی نہ ہوئی اور سزا سنائی کہ پانچ روپے جرمانہ یا پانچ چھڑیاں تمام کالج کے سامنے لگائی جائیں ۔حضور رح تو چند ماہ کے اندر ہی میرے وحشی قلب کو تسخیر کر چکے تھے ۔حضور رح کی موجودگی میں ایک عجیب سپردگی کا عالم طاری ہو جاتا ۔ میں نے دریافت کیا کہ ان میں سے پہلی سزا کونسی ہے ؟ ذرا سوچ کر فرمایا کہ جرمانہ اصل سزا ہے ۔ اگر نہ دینا چاہو تو چھڑیاں کھانا ہوں گی - جرمانہ فلاں دن تک جمع کروا دو -

اس زمانے میں پانچ روپے ایک بڑی رقم تھی ۔ جرمانہ جمع کروانے کی تاریخ سے ایک دن قبل مجھے بلا کر پوچھا کہ کہ « جرمانہ ادا کر دیا ؟ « میں نے کہا « نہیں «- ابھی گھر سے منی آرڈر نہیں آیا ۔ آنکھیں نیچی کر کے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ مجھے دیا اور کہا کہ " جاؤ ! کل جرمانہ ضرور ادا کر دو ورنہ کالج کے سامنے چھڑیاں کھانی پڑیں گی ۔ کوئی رعایت نہیں ہو گی ۔" ۔۔۔۔۔۔ ع

مت پوچھ کہ دل پر کیا گزری !

1944ء میں آپ نے پرنسپل تعلیم الاسلام کالج کے طور پر عہدہ سنبھالا ، اور کالج یونین کے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر کیلئے « حسن اور عشق « کا موضوع چنا ۔ اور اس شاعرانہ عنوان کے تحت تعلیم اور تعلیم کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا :-

" ہر طالب علم میں خدا تعالی نے ایک مخفی حسن کسی نہ کسی کمال یا استعداد کے لحاظ سے ودیعت کیا ہوتا ہے ۔ حقیقی استاد وہ ہے جو اس حسن پر عاشق ہو کر ایک والہانہ جستجو اور سرگرمی کے ساتھ اس مخفی حسن کو اجاگر کرے - پھر اس کی نشونما کا سامان کرے ۔"

آپ کا سارا تدریسی دور اپنی اس بات کا عملی گواہ ہے ۔ آپ نے ایک روایت یہ قائم فرمائی کہ ہونہار طالبعلموں کو گھر پر بلا کر انکی خاطر مدارت بھی کرتے اور انکی پڑھائی میں مدد بھی کرتے ۔ راجہ غالب صاحب بیان کرتے ہیں کہ انہیں بھی تین بار گھر بلایا اور فرمایا کرتے تھے کہ

" کسی وقت بھی گھر آجایا کرو ۔ میری ذاتی لائبریری ہے اس سے استفادہ کیا کرو ۔"

جب بھی وہ گھر گئے تو چائے ، کافی وغیرہ سے خاطر مدارت فرمائی اور کتابیں دکھائیں اور فرمایا کوئی کتاب چاہیئے تو لے لو -

آپ طلباء سے بیحد محبت اور شفقت کا سلوک فرماتے ۔ چوہدری محمد علی صاحب بتاتے ہیں کہ طلباء آپ کے شیدائی تھے اور آپ بھی ان سے بیٹوں کی طرح سلوک فرماتے ۔ ہوسٹل میں کوئی لڑکا بیمار ہو جاتا تو آدھی آدھی رات تک بیمار کے سرہانے بیٹھ کر ہاتھ سے چمچے کیساتھ دوائی کھلایا کرتے ۔ اس شفقت اور محبت کو دیکھ کر دوسرے طلباء کہا کرتے کہ ہمارا بھی بیمار پڑنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔۔ !

غریب طلباء کی بہت دلداری کرتے کہ ان کی امداد اس رنگ میں ہو کہ ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے ۔ جو طلباء مزدوری کر کے پڑھتے ان کی خاص قدر فرماتے اور ان کا ذکر اس محبت سے فرماتے کہ اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ۔غریب طلباء کی غذا ، دوا ، لباس ، سویابین اور پتہ نہیں کیا کیا ان کے لئے مہیا فرماتے -

ڈسپلن (Discipline) کے معاملے میں سختی بھی فرماتے تھے ۔ بعد میں دلداری بھی کرتے اور فرمایا کرتے کہ

" استاد کو باپ اور ماں ، دونوں کا کردار ادا کرنا چاہئے ۔۔۔۔ !"

آپ کا تعلق طلباء سے محبت اور تکریم کا تھا ۔ ان سے مزاح بھی فرماتے تھے اور بے تکلف بھی ہوتے ۔ لیکن حدود قائم رہتیں ۔ اپنے طلباء کے کردار کی تعمیر پر بھی خاص توجہ تھی ۔ اور اگر اصلاح کے طور پر کبھی بدنی سزا دینی پڑی تو آپ پر غم کی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ اور کئی بار ایسا ہوا کہ اس تکلیف میں کتنا کتنا عرصہ گھر سے تشریف نہ لاتے ۔

کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور انکی تکریم کرتے ۔ خاص طور پر روئنگ (Rowing) اور باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کی ۔ لیکن اگر کبھی وہ قانون شکنی کرتے تو سختی بھی اتنی ہی فرماتے ۔

ایک Rowing کے لڑکے سے غلطی ہوئی جو Rowing کا بھی اور کبڈی کا بھی کپتان تھا ، اور نہایت ذہین طالب علم تھا ۔ سکالرشپ ہولڈر تھا ۔ اسے اور خرچ بھی دیتے تھے ۔ اور آپ کے گھر سے کھانا بھی آیا کرتا تھا اور اسکی خوب ناز برداری بھی ہوتی ۔ لیکن جب اس نے کالج کے ایک استاد کیساتھ گستاخی کی تو اسے دو سال کیلئے کالج سے نکال دیا ۔ میں نے آپکو بڑے سے بڑے حادثے پر روتے نہیں دیکھا - لیکن میں نے دیکھا

کہ اس لڑکے کے اخراج از کالج کے فارم پر دستخط کرتے ہوئے حضور رح کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں تھیں۔

اگر کوئی خاص سنگین قسم کی قانون شکنی نہ ہوتی تو چھوٹے موٹے جرمانے آپ اپنی محبت اور نرم دلی کی وجہ سے معاف کر دیا کرتے۔ جناب پروفیسر محبوب عالم صاحب خالد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خاکسار نے عرض کیا کہ ڈسپلن کیسے رہے؟ ہم طلباء کی غفلتوں پر جرمانہ کرتے ہیں مگر آپ اسے معاف فرمادیتے ہیں- آپ نے جواب تحریر فرمایا کہ:

''اگر طلباء کیلئے میرے دل میں خدا تعالیٰ نے رحم ڈالا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ باقی حالات از خود ٹھیک ہوجائینگے۔۔۔۔ (ناصر احمد)

آپ کی شخصیت میں ایک خاص رعب اور وقار تھا۔ آپ کا خوبصورت شگفتہ چہرہ اور نرم مسکراہٹ، اپنے پرائے سب کا دل موہ لیتی- چوہدری محمد علی صاحب لکھتے ہیں کہ لاہور کے کالجوں کا طالب علم جانتا تھا کہ پرنسپل تعلیم الاسلام کالج، کس بلند مرتبہ اور کردار کے انسان ہیں۔ دوسرے کالجوں کے پرنسپلوں کی موجودگی میں شوخی کرنیوالے حضور رح کے سامنے ادب سے گفتگو کیا کرتے تھے۔حضور رحم اللہ بھی بلا تخصیص انہیں اپنا عزیز طالب علم جانتے تھے اور ان کے جائز حقوق کی حفاظت کیلئے کوشاں رہتے تھے-

یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں سالانہ کھیل ہو رہے تھے۔حضور رح ایک کھیل کے نگران اور منصف تھے۔ اس کھیل کے گراونڈ پر بہت سے طلباء بیٹھے تھے۔حضور رح نے ایک اور کالج کے پرنسپل جو مارشل کی ڈیوٹی دے رہے تھے، ان سے کہا کہ مہربانی فرما کر ان طلباء کو یہاں سے جانے کیلئے کہیں تا کہ کھیل شروع ہو سکے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ

کیا آپ کو نہیں پتہ یہ کس کالج کے طالب علم ہیں؟ کیا میں نے اپنی بے عزتی کروانی ہے!؟

آپ نے جواب دیا:

''اچھا یہ بات ہے تو میں خود انہیں اٹھا دیتا ہوں۔ اور یہ میری بے عزتی نہیں کریں گے۔''

حضور رحمہ اللہ ان طالب علموں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے درمیان جا کر بیٹھ گئے۔ پہلے ان سے چند باتیں کیں اور پھر فرمایا کہ جس جگہ آپ بیٹھے ہیں، یہاں مقابلے منعقد ہونے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ یہ جگہ خالی کر دی جائے؟ اس پر وہ طلباء چھلانگیں لگاتے ہوئے جنگلے کے عقب میں چلے گئے-

پنجاب یونیورسٹی کا مشہور واقعہ ہے کہ اندر سینٹ ہال میں میٹنگ ہو رہی تھی اور باہر طلباء نعرے لگا رہے تھے۔ یونیورسٹی کے اکابرین اور دیگر ارکان بار بار باہر آ کر طلباء کو تسلی دیتے اور خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔جس پر طلباء آوازے کستے اور اکابرین کو واپس جانے کیلئے کہتے۔ انجام کار حضور رحمہ اللہ خود باہر تشریف لائے اور طلباء کو پاس بلا کر کہا کہ:

''اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو، خاموشی سے انتظار کیجئے اور اگر اعتماد نہیں تو کم از کم میرے یہاں بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں۔ میں واپس اپنے کالج چلا جاتا ہوں۔''

طلباء نے یک زبان نعرہ لگایا کہ ہمیں آپ پر اعتماد ہے۔ اور خاموش ہو گئے۔ چنانچہ حضور رح واپس میٹنگ میں تشریف لے آئے۔ اور یوں محبت اور انصاف دونوں کے تقاضے پورے کرنیوالا فیصلہ فرمایا-

ایک دفعہ لاہور کے کالجوں نے سٹرائیک (Strike) کی اور تعلیم الاسلام کالج کا گھیراو کر لیا کہ اسے بھی بند کیا جائے۔حضور رح نے فرمایا کہ:

''قطع نظر اس کے کہ ہم سٹرائیک کو ناجائز فعل سمجھتے ہیں، اگر آپ اپنے دل سے پوچھ کر دیانت داری سے بتائیں کہ اس طرح سٹرائیک کرنے سے کشمیر مل جائے گا تو---میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تو کیا، اگر تعلیم الاسلام کالج بالکل ہی بند کرنا پڑے تو بند کر دونگا۔''

اور چند منٹ میں اپنی دلآویز مسکراہٹ کیساتھ ان سے گفتگو فرمائی۔لڑکے قائل ہو گئے۔ اور ''پرنسپل تعلیم الاسلام کالج، زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ پروفیسر صوفی بشارت الرحمن صاحب مرحوم نے بیان کیا کہ لاہور کے کالج کے زمانے کا ہی واقعہ ہے کہ دریائے راوی میں تعلیم الاسلام کالج اور غالباً اسلامیہ کالج لاہور کا بمپنگ ریس (Bumping Boat Race) کا مقابلہ تھا۔ اور جیتنے والی ٹیم نے اس سال کی چیمپئین شپ (Championship) حاصل کرنی تھی۔ دریا پر اسلامیہ کالج کے لڑکے بھی نعرے لگا رہے تھے۔ اور ہمارے کالج کے لڑکے بھی اپنی ٹیم کو ''حب زا'' کہنے کیلئے جمع تھے۔لیکن فضاء میں کھچاو تھا۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل نے مائیک پر اعلان کیا کہ اگر ان کی ٹیم نے ٹی آئی کالج کی ٹیم کو بمپ کر دیا

تو وہ اپنی ٹیم کو 100 روپے انعام دیں گے۔

اس پر ٹی آئی کالج کے پرنسپل (یعنی حضور رحمہ اللہ) نے اعلان کروایا کہ:

اگر اسلامیہ کالج کی ٹیم نے ٹی آئی کالج کی ٹیم کو بمپ کر دیا تو پرنسپل ٹی آئی کالج کی طرف سے بھی اسلامیہ کالج کی ٹیم کو سو روپے انعام دیا جائیگا۔

اسلامیہ کالج کے طلباء نے یہ اعلان سن کر زور دار نعرہ لگایا: ''پرنسپل ٹی آئی کالج ، زندہ باد!'' اس کے ساتھ ہی کدورت بھی دور ہو گئی اور بھائی چارے کے ماحول میں مقابلہ شروع ہوا۔ اس اعلان نے اپنے کالج کی ٹیم پر بھی عجیب نفسیاتی اثر کا جادو کر دیا۔ ان کو یہ زبردست احساس ہوا کہ ہمارے پرنسپل صاحب کو ہم پر کسقدر یقین ہے۔ اس احساس نے ان کے اندر بجلی جیسی قوت اور جوش بھر دیا۔ اور ہماری ٹیم جیت گئی اور چیمپین شپ کی حقدار ٹھہری۔

آپ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ خواہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ حق بات ضرور کہتے اور طالب علموں کیلئے بیحد غیرت رکھتے تھے۔ خواہ وہ اپنے ہوں یا غیر۔ چوہدری محمد علی صاحب مرحوم ومغفور ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

پاکستان بننے کے کے بعد پہلی دفعہ یونیورسٹی آفیسرز ٹریننگ کا پہلا کیمپ لگا اور تمام پنجاب کے کالجوں سے اساتذہ اور طلباء شامل ہوئے۔ آٹھ کمپنیاں تھیں (یعنی دو بریگیڈ) - کیمپ کے حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ اساتذہ اور طلباء کو فوجی رینک ملے ہوئے تھے۔ اس کیمپ کا ایڈجوٹینٹ (Adjutant) ایک فوجی افسر تھا۔ جو انکو بسا اوقات فحش گالیاں دیا کرتا تھا۔ کیمپ میں کافی کھچاو تھا۔ کمانڈر انچیف جو ان دنوں انگریز تھے، اس کیمپ کا دورہ کرنیوالے تھے۔

نہ جانے کیسی گالی اس فوجی افسر نے دی کہ سب طلباء بے قابو ہو گئے۔ اور فیصلہ کرلیا کہ سٹرائیک کریں گے۔ اور کمانڈر ان انچیف کی آمد اور تقسیم انعامات کے موقع پر اپنے اپنے کیمپوں میں بیٹھے رہیں گے۔ نہ صفائی کرینگے اور نہ وردیاں پہنیں گے۔

ہم نے کچھ اساتذہ اور لڑکوں کو ملا کر ایک ایک کیمپ میں جا کر لڑکوں کو سمجھایا کہ پاکستان کا پہلا کیمپ ہے۔ انگریز ''C - in - C'' ہے۔ وہ کیا کہیں گے!؟

لڑکوں نے پاکستان کے نام پر ایسی غیرت دکھائی کہ راتوں رات صفائی بھی کر لی اور سجاوٹ بھی۔ اگلے دن کمانڈر ان چیف نے نمائشی جنگ دیکھی۔ تقسیم انعامات کی تقریب شروع ہونیوالی تھی - طلباء اور اساتذہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ وزراء، جج صاحبان، وائس چانسلر صاحب، جنرل آفیسر کمانڈنگ لاہور گیرژن، اور انکے سینئر افسران اور دوسرے معززین شہر آ چکے تھے۔ اور کمانڈر انچیف کے استقبال کیلئے کھڑے تھے کہ پنڈال میں، جہاں ہر دو بٹالین بیٹھی ہوئی تھیں، اس افسر نے پھر کوئی گالی دے ڈالی۔ اس پر پھر وہی پہلی والی ٹینشن پیدا ہو گئی۔

عین اس وقت اس عاجز نے حضور رح کی «ولزلے» کار کو آتے دیکھا۔ تو بڑھ کر استقبال کیا اور وہیں روک کر سارے حالات اور موجودہ کیفیت عرض کی۔ حضور رح آگے تشریف لائے تو سب لوگ حضور سے ملے۔ ان میں وہی افسر بھی تھے۔ حضور نے انگریزی زبان میں ان سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا؟! اور یہ کہ شکر ہے سٹرائیک ختم ہو گئی۔

اس پر وہ افسر بولے کہ:-

''مجھے ان۔۔۔۔ (گالی) کی کیا پرواہ ہے!!''

یہ فقرہ کافی بلند آواز میں کہا اور پھر اسے دھرایا۔ تمام مہمان حضرات یہ سن رہے تھے۔ پہلے تو حضور رح بھی خاموش رہے کہ کوئی نہ کوئی مناسب آدمی ان کو ٹوکے۔ جب تیسری مرتبہ بھی یہ فقرہ دھرایا (گالی دے کر) تو حضور نے بڑے جلال سے بلند آواز سے فرمایا:-

''آپ کو پرواہ ہو نہ ہو، لیکن ہمیں ان کی بڑی پرواہ ہے۔ یہ قوم کے بچے ہیں۔ ہم ان کو اس قسم کے اخلاق سیکھنے کیلئے یہاں نہیں بھیجتے۔''

اور پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا:-

''ابھی اپنی تعلیم الاسلام کالج کی پلٹن کو کہو کہ واپس چلیں اور آئندہ سے یونیورسٹی آفیسر ٹریننگ کور سے الحاق ختم کر دیا جائے۔''

حضور رحمہ اللہ یہ فرما کر اپنی کار کی طرف جانے لگے۔ تو وہاں موجود لوگ جو پہلے منجمد ہو کر رہ گئے تھے، حرکت میں آ گئے۔ اور کچھ نے حضور رح کا راستہ روک لیا۔ اور کچھ نے اس افسر کو ڈانٹا اور اس نے بڑی لجاجت سے حضور رح سے معافی مانگی اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب حضور رح نے وہ کلمات کہے تو میرے ایک غیر از جماعت دوست نے (جنہیں کچھ زیادہ ہی گالیوں کا نشانہ بننا پڑا تھا، اور جو بعد میں کمشنر سرگودھا بھی رہے) فرط جذبات میں خوشی سے بیقرار ہو کر میرا ہاتھ دبایا اور اتنے زور سے دبایا کہ کئی دن تک میرا ہاتھ دکھتا رہا - ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے جا رہے تھے کہ:

میاں صاحب کو ایسے لوگوں کی کیا پرواہ ہے۔۔۔!

(باقی صفحہ 36)

کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا!؟

کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا!؟

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی» خصائص الکبری «میں تحریر فرماتے ہیں:-

ترجمہ:- بیہقی اور ابونعیم نے قبصیہ زویب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک شخص محلم بن جثامہ نے مشرکوں کے گروہ پر حملہ کیا۔مشرک شکست کھا گئے۔ ایک مشرک پر غشی طاری ہوگئی۔ جب اسے تلوار لے کر قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس آدمی نے کہا «لا الہ الا اللہ «-مگر۔۔۔ اسکے باوجود محلم بن جثامہ اس سے گتھم گتھا ہوگیا اور اسے قتل کر کے ہی دم لیا-

بعد ازاں اس شخص کے دل میں اس شخص کے قتل پر خلش پیدا ہوئی تو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ساری بات کہہ دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«کیا تو نے اس کا دل چیر کے معلوم کر لیا تھا!؟«

یہ قاتل، اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مر گیا اور دفن کر دیا گیا-لیکن زمین نے اسے باہر پھینک دیا۔اس پر اس کے اہل وعیال حضور ص کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اطلاع دی-حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ «اسے دفن کر دو«-چنانچہ اسے پھر دفن کر دیا گیا۔

لیکن زمین نے اسے پھر باہر پھینک دیا۔اور ایسا تین بار وقوع پذیر ہوا-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

زمین نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے-اس لئے اسے کسی «غار میں پھینک ڈالو «-

طبرانی اور بیہقی نے بحوالہ حسن لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اگرچہ زمین اس شخص سے بھی بدتر انسان کو اپنے اندر جگہ دے دیتی ہے مگر اللہ تعالی کا ارادہ یہ ہے کہ اس (خبیث) کو تمہارے لئے عبرت کا نشان بنا دے۔ تا کہ آئندہ تم میں سے کوئی ایسے شخص کو قتل کرنیکی جرات نہ کر سکے جو کلمہ شہادت پڑھتا ہے یا کہتا ہے» انی مسلم «((میں مسلمان ہوں)-

(''خصائص الکبری''، جلد ۲ صفحہ ۷۷-۷۸-طبع اولی۔ دائرہ المعارف العظامیہ، حیدرآباد دکن)

ہائے افسوس! ارض وطن پاکستان میں بھی وفات پا جانے والے احمدیوں کیساتھ بعض مقامات پر بعینہ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے، جو اوپر بیان شدہ واقعہ میں «محلم بن جثامہ «کے ہاتھوں سرزد ہوا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان «میں آج انسانیت خونچکاں ہے۔ وہ انسانی قدریں مٹتی، بجھتی اور نابود ہوتی چلی جارہی ہیں، جن سے انسانی اقدار کی شمع روشن کہلائے جانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔

کتنے ہی احمدیوں کی زندگیوں کے چراغ گولیوں اور خنجروں سے بجھائے جا چکے ہیں۔ آنکھیں دیکھتی ہیں، مگر اعتبار کی جرات نہیں کر پاتیں۔ کان المناک واقعات کو سنتے ہیں مگر یقین نہیں کر پاتے اور درد ہے کہ انسانیت اور مسرتوں کی پسلیاں توڑتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ع

غرق خود اپنے لہو میں آفتاب شام ہے
کیا یہی ہر تابدار آغاز کا انجام ہے؟

بقیہ از: حضرت حافظ مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ
ایک شفیق اور ڈسپلن کے پابند استاد!

محکمہ تعلیم کے ایک بڑے افسر نے کہا کہ:

مرزا صاحب نے سب کی عزت رکھ لی۔۔۔!

اس واقعے کا سب سے عجیب تر حصہ یہ ہے کہ کیمپ کے خادموں پر کہ جب بھی کوئی ٹرک روانہ ہوتا تو اس میں بیٹھنے والے:

''مرزا ناصر احمد زندہ باد، پرنسپل ٹی آئی کالج زندہ باد'' کے نعرے ضرور لگاتے اور اس انداز سے یہ کیمپ ختم ہوا-

محکمہ تعلیم کے ایک بڑے افسر نے کہا کہ:

(وقعات از: ''حیات ناصر'')

خوشبو

(محمد اسلم صابر، پروفیسر جامعہ احمدیہ کینیڈا)

مجھے تُو نے کہا ہے مرزائی
ترے منہ میں مٹھائی میرے بھائی
میں خوش قسمت ہوں اس نسبت پہ نازاں
ہے کی تو نے مری عزت افزائی
اسی برکت کی نسبت سے ہوا ہوں
دل و جاں سے محمد ﷺ کا فدائی
وہی موعود و مہدی مرزا ہیں
بر جن کی تھی نبیوں نے سنائی
سرا سر رحم و احساں ہے وہ ہستی
جو صدیوں بعدیہ نعمت ہے لائی
تری خواہش ہے کہ داخل ہو نہ کوئی
دعامیری کہ آئے سب خدائی
مَیں تیری خیر کا ہوں آرزومند
ترے دل میں ہے کیوں نفرت سمائی
جہاں میں اک نشاں ہے احمدیت
سمجھتا کیوں ہے تو اس کو برائی
یہ ہے فضل عظیم ربّ اکبر
خلافت کی لڑی ہم کو تھمائی
اسی نے آج دستار فضلیت
سر مسرور پر خود ہے سجائی
ادھر بندوں کا ایک تانتا بندھا ہے
خدا نے کی ہے جن کی راہنمائی
ہیں چرچے اب تو اس کے سب جہاں میں
یہاں آؤ ! اسی میں ہے بھلائی
نہ پہچانے امام وقت کو جو
خدا جانے ہے کیسی پارسائی
بروز حشر کیا ہوگا بہانہ ؟
کہ جب کام آئیں گے آباء نہ بھائی
بفضل ایزدی ہم احمدی ہیں
کہو کچھ اور یا کہ میرزائی
گلابوں کا کوئی بھی نام رکھ دو
ہے ان سے تو سدا خوشبو ہی آ ئی
دلوں کو پھیر دے اس سمت مالک
ترے در پہ ہے صابرؔ کی دہائی

آج ہم دیکھتے ہیں کہ نورالدین کا خدا کس طرح کھلاتا ہے۔

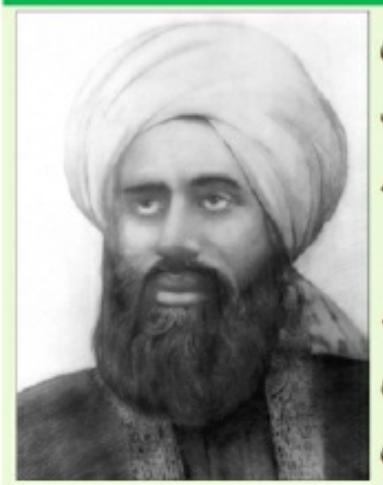

حضرت حکیم محمد صدیق صاحبؓ کی روایت ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

”ایک دفعہ تین ساتھیوں کے ساتھ ہم راستہ بھول گئے اور کہیں دور نکل گئے۔کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔میرے ساتھیوں کو بھوک اور پیاس نے سخت ستایا۔تو ان میں سے ایک نے کہا نورالدین جو کہتا ہے کہ میرا خدا مجھے کھلاتا پلاتا ہے،آج ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح کھلاتا پلاتا ہے۔“

فرمایا کرتے تھے کہ میں دعا کرنے لگا۔چنانچہ جب ہم آگے گئے تو پیچھے سے زور کی آواز آئی۔ٹھہرو،ٹھہرو!جب دیکھا تو کیا دیکھا کہ دو شتر سوار تیزی کے ساتھ آ رہے تھے۔

جب پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم شکاری ہیں۔ہرن کا شکار کیا تھا اور خوب پکایا۔گھر سے پراٹھے لائے تھے۔ہم سیر ہو چکے ہیں اور کھانا بھی بہت ہے۔آپ کھالیں۔چنانچہ ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ نورالدین سچ کہتا تھا۔

فرمایا کرتے تھے کہ:

”اللہ تعالیٰ کا نورالدین کے ساتھ وعدہ ہے کہ میں تیری ہر ضرورت کو پورا کروں گا۔کیا کوئی بادشاہ بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے۔“

(حیات نور۔صفحہ 167)

T.I. College staff with Hadhrat Khalifatul Masih II[ra]
at the opening ceremony of the College Building, 1954

Ch. Mohammad Ali, Chinese Ambassador, Ch. Zahoor Bajwa & Prof. Dr. Naseer Ahmad Khan,
Visit to New Campus TIC, Rabwah
1974

پنجاب کا نقش جمال اور میرا مقدمہ

عرفان احمد خان۔ جرمنی

ماضی قریب کا ایک بڑا نام محمد حنیف رامے جن کی شخصیت سے ان کا سیاسی دور منفی کر دیا جائے تو رامے صاحب اپنے وقت کے بہترین دانشور، ادیب، صحافی اور خطاط تھے۔ 1985ء میں ان کی ایک کاوش کو جنگ پبلشرز نے کتابی صورت میں پنجاب کا مقدمہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ 38 سال پہلے یہ تحریر مظلوم پنجاب کی داستان محسوس ہوئی۔عید الاضحیٰ پر احمدیوں کو نماز عید کی ممانعت اور ان کو قربانی کرنے سے روکنے کے لیے جس طرح پنجاب کے بعض طبقات معہ پنجاب پولیس جس زور شور سے حرکت میں تھے مجھے پنجاب کا مقدمہ نامی کتاب یاد آ گئی۔ دل دوبارہ اس کتاب کو پڑھنے کو چاہا۔ چنانچہ فرینکفرٹ سے مانٹریال کی فلائٹ کے دوران یہ کتاب میری ہم سفر تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب وہ خطہ ارض ہے جس کی سوان وادی میں انسانی وجود کے اولین نشانات ملتے ہیں۔ اسی سرزمین پر ہڑپہ کے نام سے دنیا کی سب سے پہلی انسانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔حضرت داتا گنج بخش، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی، حضرت فرید الدین گنج شکر، حضرت میاں میر، امام بری لطیف وہ بزرگان دین ہیں جنہوں نے اس سرزمین میں اسلام کی محبت، مساوات اور رواداری کی تعلیم عام کی۔ پانچ صوفی شاعروں شاہ حسین، سلطان باہو، وارث شاہ، بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے میٹھے اور دوستی کے گیت آج بھی پنجاب کی ثقافت کا حصہ مانے جاتے ہیں۔

حنیف رامے ننکانہ میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں پلے بڑھے۔ گورنمنٹ کالج سے سند یافتہ تھے۔ اس لیے پنجاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

" پنجاب کی گھنی چھاؤں اور اس کے جمال کا نقشہ ہی اور ہے۔ پنجاب کا وہ نقش جمال جو پہلے میں نے اپنے دل میں دیکھا، پھر اپنی آنکھوں میں بسایا اور اب ارباب وطن کے سامنے لا رہا ہوں۔ میں نے ایک عمر اس پنجاب کے شہروں، قصبوں، دیہاتوں، گلی محلوں اور بازاروں میں انسانوں کو محبت اور رواداری سے جیتے دیکھا ہے۔ یہ محبت اور رواداری پنجاب کے مزاج کا بنیادی اور لازمی جز ہے۔ پنجاب خوبصورت ہے، طرح دار ہے، انسان دوست ہے، ملنسار ہے، خود دار ہے سخی ہے لیکن یہ محبت اور رواداری دوسروں کو نظر نہیں آتی۔" عید الاضحیٰ پر پنجاب نے جو سلوک مجھ سے اور میرے پیاروں کے ساتھ کیا اس کا نقش جمال اس سے یکسر مختلف ہے جو رامے صاحب نے بیان کیا ہے۔ گھروں میں داخل ہو کر قربانی کے جانور کھول کر لے جانا، فرج سے قربانی کا گوشت زبردستی نکال کر لے جانا یہ ہے وہ محبت اور رواداری جو بقول حنیف رامے دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ ایسی رواداری پر تو ماتم کرنے کو جی کرتا ہے۔جس محبت اور رواداری کو پنجاب کے مزاج کا بنیادی اور لازمی جز بتایا جا رہا ہے اس مزاج نے پولیس کو مجبور کیا کہ وہ مساجد سے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرے کہ احمدی عید کی نماز پڑھنے کے لیے جمع نہ ہوں۔ پنجاب کا نقش جمال ۱۹۵۳ء میں گہنا گیا اور اب تک گھناؤنا ہو چکا ہے۔ پورے پنجاب میں احمدیوں نے خوف کے سائے تلے عید کا دن گزرا۔ کیسی خوشی اور کیسی مسرتیں۔ اپنے وطن میں زمین اس قدر تنگ کر دی گئی ہے کہ احمدی لوگوں کے ایک دوسرے کو مبارک باد دینے میں سینکڑوں مشکلات حائل تھیں۔ کالم میں گنجائش نہیں کہ میں بی بی سی اور وائس آف امریکہ پر جاری ہونے والی رپورٹس کی تفصیل بتا کر قارئین کے سامنے اہل پنجاب کی رواداری کا بھانڈا پھوڑ سکوں۔ انگریزی اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق آٹھ قصبات میں پولیس آفیسرز نے ڈرا دھمکا کر احمدیوں سے تحریر پر دستخط حاصل کیے کہ وہ عید کا تہوار نہیں منائیں گے۔ اس نوعیت کی خبروں سے سوشل میڈیا، فیس بک اور ٹویٹر بھرے پڑے ہیں۔ بزرگان دین اور صوفی شعراء کی سرزمین سے ایک آواز بھی اس ظلم جبر و استبداد کے خلاف سنائی نہیں دی۔ جبکہ دعویٰ ہے انسان دوست اور ملنساری کا۔ امرتا پریتم نے تو وارث شاہ سے فریاد کی تھی:

آج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے آج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

میرا دل کرتا ہے کہ کتاب پنجاب کا مقدمہ ہاتھ میں تھامے میانی قبرستان میں حنیف رامے کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر پوچھوں:

اٹھ دردمنداں دیا درد یا تک اپنا پنجاب
آج بیلے لاشاں وچھیاں لہو دی بھری چناب

احمدی جنہوں نے اس وطن کو بنانے اور سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کیا ان کے ارمانوں کا خون ستر سال سے پنجاب کے دریاؤں میں بہایا جا رہا ہے۔عید کے بعد پنجاب کے جن احمدیوں کے خلاف ایف آئی آر درج ہوئیں ان کی تفصیل کالم کے چھپنے تک دوسرے ذرائع ابلاغ سے قارئین کے علم میں آچکی ہو گی۔ جو پنجاب کی رواداری کی اصل تصویر ہے۔

مذہب کی آڑ لے کر احمدیوں کے خلاف جبر و استبداد کے جس کلچر کو فروغ دیا گیا اس سے ملک دشمنی کی راہیں بھی کھلیں اور انسانوں کے درمیان نفرتیں پیدا کرنے والوں کو بھی میدان ہاتھ آ گیا۔عید پر ۸۴ ایسی کالعدم تنظیموں کے نام سامنے اے ہیں جن کو قربانی کی کھالیں دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور ان میں وہ کالعدم تنظیم بھی شامل ہے جس کے کارکنوں نے پنجاب پولیس کے ہم قدم بن کر احمدیوں کو قربانی نہ کرنے کی وارننگ جاری کیں۔ آئندہ الیکشن میں اس تنظیم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے وزیر داخلہ رانا ثناء اللہ اور سابق چیئرمین سینٹ سردار ایاز صادق نے مزاکرات کیے اور ایک مشترکہ معاہدہ طے پایا۔جس کی بازگشت ذرائع ابلاغ پر بھی سنی گئی۔ یہ اسی معاہدہ کا نتیجہ ہے کہ تحریک لبیک اس بار عید پر زیادہ کھل کر احمدیوں کی مخالفت پر میدان میں اتری۔ میرا مقدمہ ایسی لالچی اور کمزور حکومت کے سامنے نہیں بلکہ میری التجا اپنے خالق حقیقی کے سامنے ہے کیونکہ مخالفت کو نہ پہلے کبھی احمد کی خاطر میں لائے ہیں اور نہ آئندہ ان مخالفتوں سے خوف کھائیں گے۔ کیونکہ وہ پورے یقین کے ساتھ اس دامن سے وابستہ ہو چکے ہیں جس نے تمہیں بھی یہ بتلا کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً یاد رکھو اور کان کھول کر سنو کہ میری روح ہلاک ہونے والی روح نہیں اور میری سرشت میں ناکامی کا خمیر نہیں مجھے وہ ہمت اور صدق بخشا گیا ہے جس کے آگے پہاڑ ہیچ ہیں۔ میں کسی کی پرواہ نہیں رکھتا۔ میں اکیلا تھا اور اکیلا رہنے پر ناراض نہیں کیا خدا مجھے چھوڑ دے گا کبھی نہیں چھوڑے گا کیا وہ مجھے ضائع کر دے گا کبھی نہیں ضائع کرے گا۔ دشمن ذلیل ہوں گے اور حاسد شرمندہ اور خدا اپنے بندہ کو ہر میدان میں فتح دے گا۔ میں اس کے ساتھ وہ میرے ساتھ ہے کوئی چیز ہمارا پیوند توڑ نہیں سکتی۔" نیز فرمایا:

"کسی ابتلا سے اس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں اگرچہ ایک ابتلا نہیں کروڑ ابتلا ہوں۔ ابتلاؤں کے میدان میں اور دکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے"۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد 9 صفحہ 23)

..اس پر بھی نہ پینا آیا

ایک محفل میں مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خان حاضر تھے۔ مولانا آزاد کو پیاس محسوس ہوئی تو ایک بزرگ جلدی سے پانی کا پیالہ لے آئے۔ مولانا آزاد نے ہنس ارشاد کیا:

لے کے اک پیر مغاں ہاتھ میں مینا، آیا

مولانا ظفر علی خان نے برجستہ دوسرا مصرع کہا:

مے کشو! شرم، کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

❁❁

ایک محفل میں کچھ شاعر بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے شعر سنائے جس میں دونوں کے تخلص نظم تھے۔ وہاں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سن کر کہنے لگے:

"اس شعر میں سائل اور بیخود تخلص صرف نام معلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں تخلص بھی نظم ہو اور محض نام معلوم نہ ہو۔"

کسی نے کہا یہ کیسے ممکن ہے؟ حیدر نے وہیں برجستہ یہ شعر کہہ کر سب کو حیران کر دیا:

پڑا ہوں میکدے کے در پر اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

❁❁

ایک مولانا کے جوش صاحب کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ کئی روز کی غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش صاحب نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے: کیا بتاؤں جوش صاحب، پہلے ایک گردے میں پتھری تھی اس کا آپریشن ہوا۔ اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔

میں سمجھ گیا۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔

❁❁

مرے وطن....

رشید قیصرانی

تری طلب، تری خوشبو، ترا نمو بولے
مرے وطن مری رگ رگ میں صرف تُو بولے

نَفس نَفس تو مرے سانس کی گواہی دے
ترے بدن میں مِرا دل، مِرا لہو بولے

صدا کی لہریں ہم اک دوسرے کے گِرد بنیں
میں قریہ قریہ پکاروں، تُو کُوبکُو بولے

میں حرف حرف سجا لوں صحیفۂ دل پر
تُوبرگ برگ سر شاخِ آرزو بولے

وہ دن بھی آئے کہ لکھوں میں شش جہت ترا نام
ترا علم ، تری سج دھج بھی چار سُو بولے

وہ دن بھی آئے کہ مہکے ترا گلاب شباب
چمن چمن ترا انداز رنگ و بُو بولے

وہ دن بھی آئے کہ لکھا ترا امر ٹھہرے
جو تو کے وہی دنیا بھی ہو بہو بولے

نشانِ حُرمت و تقدیس حرف جب تجھ سے
کوئی بھی بولنا چاہے تو با وضو بولے

مرے وطن سر مینار نور تا بہ ابد
تُو چاند بن کے اندھیروں کے رُو برو بولے

خموش کیوں ہے یہ مسکن قلندروں کا رشید
کوئی تو وجد میں آئے، کوئی تو ہُو بولے

روح حضرت مصلح موعودؓ سے۔ پیمان شاعر

(ثاقب زیروی)

تونے کی مشعل احساس فروزاں پیارے
دل بھلا کیسے بھلا دے تیرا احساں پیارے
روح پر مردہ کو ایماں کی چلا ئیں بخشیں
اور انوار سے دھو ڈالے دل و جاں پیارے
ولولوں نے تیرے ڈالی مہ و انجم پہ کمند
تونے کی سطوت اسلام درخشاں پیارے
اب وہی دینِ محمدؐ کی قسم کھاتے ہیں
تھے جو مشہور کبھی دشمن ایماں پیارے
پہلے بخشا میرے بہکے ہوئے نغموں کو گداز
پھر مری روح پہ کی درد کی افشاں پیارے
مجھ کو بھولے گی کہاں وہ تری بھر پور نگاہ
جگمگا اُٹھا تھا جب فکر کا ایواں پیارے
اب نگاہیں تجھے ڈھونڈیں بھی تو کس جا پائیں
جانے کب پائے سکوں پھر دل ویراں پیارے
کون افلاک لے جائے یہ روداد الم
ترا متوالا ہے ابھی تک پریشاں پیارے
روح پھرتی ہے بھٹکتی ہوئی ویرانوں میں
دل سے نیرنگی افلاک حیراں پیارے
شکر ایزد تری آغوش کا پالا آیا
اپنے دامن میں لئے دولت عرفاں پیارے
فکر میں جس کے سرائت تری تخیل کی ضو
جس کی ہر ایک نوا درد کا عنواں پیارے
دیکھ کر اُس کو لگن دل کی بجھا لیتا ہوں
آنے والے پہ نہ کیوں جان ہو قرباں پیارے
تیری اس شمع کا پروانہ صفت ہوگا طواف
تیرے ثاقبؔ کا ہے اب تجھ سے یہ پیماں پیارے

طب وصحت

کولیسٹرول

کولیسٹرال فری (Cholesterol Free) آپ نے اکثر یہ الفاظ کوکنگ آئل (خوردنی تیل) اور دیگر غذائی اشیاء کے پیکٹوں پر لکھے دیکھو کولیسٹرول اور ہر دوسرا شخص اس بات کا شاکی بھی نظر آئیگا کہ کولیسٹرول بڑھ گیا ہے

آخر یہ کولیسٹرول ہے کیا چیز !؟

دراصل خون میں موجود چربی کی ایک قسم کو «کولیسٹرول» کہتے ہیں جو کہ جسم کے ہر خلیہ میں موجود ہوتا ہے۔ کیمیائی لحاظ ہے۔ کیمیائی لحاظ سے خالص کولیسٹرول ایک اسٹیرائیڈ ہے جو سفید رنگ کا ایک بے رنگ و بوحقیقت یہ ہے کہ کولیسٹرول انسانی صحت کیلئے نہایت اہم عنصر ہے۔ اور فی ذاتہ کوئی نقصان دہ مادہ نہیں، البتہ اس کا حد بڑھ جانا مضرصحت ہے۔ جگر انسانی جسم کا وہ عضو ہے جو سب سے زیادہ کولیسٹرول پیدا کرتا ہے۔ اسکے علاوہ آنتیں اور جلد وغیرہ بھی کولیسٹرول پیدا کرتے ہیں - ایک عام انسان کے جسم میں ۲۰۰ سے ۲۱۰ ملی گرام کولیسٹرول موجود ہوتا ہے اگرچہ یہ سارے جسم میں پایا جاتا ہے، تاہم اسکی سب سے زیادہ مقدار دماغ اور ریڑھ کی ہڈی میں پائی جاتی ہے

اس کی مناسب مقدار انسانی زندگی کیلئے بہت ضروری ہے۔ مگر زیادتی، دل کے مختلف امراض کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کی ضرورت سے زیادہ مقدار خون کی شریانوں میں جم کر خون کے بہاو میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب بن سکتی ہے - جو دل کی بیماریوں کا باعث ہوتا

فوائد:

کولیسٹرول دھوپ کی وجہ سے جسم میں وٹامن۔ ڈی میں تبدیل ہوجاتا ہے جو ہڈیوں کی نشونما کیلئے ضروری ہے۔ اسی لئے ایسے علاقوں میں جہاں سورج نہیں نکلتا یا کم نکلتا ہے، ان میں ہڈیوں کی بیماریاں عام ہیں۔

کولیسٹرال جسم میں ایسے کیمیائی مادے بھی پیدا کرتا ہے جو چکنائی ہضم کرتے ہیں۔ کولیسٹرال سے بننے والا ایک کیمیائی مادہ Corticosteroid جوڑوں کی بیماریوں کیخلاف مزاحمت، جسم موجود کاربوہائڈریٹس کو ہضم اور الرجی سے بچاؤ میں مدد دیتا ہے۔ کچھ ضروری ہارمونز کا خام مادہ بھی اس سے تیار ہوتا ہے۔ اس لئے گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اس کی زیادتی یقینا تکلیف دہ ہے اور اس کی زیاتی کی بنیادی وجہ:

خوراک میں بے اعتدالی – اور

اپنے ہاتھ سے کام کاج نہ کرنا وغیرہ ہے

خصوصاً پیدل چلنا تو ہم جیسے بھول ہی بیٹھے ہیں۔۔۔۔!!

کولیسٹرول کی اقسام:-

خون میں کولیسٹرول کی کی اقسام موجود ہوتی ہیں۔ جن میں مجموئی کلیسٹرول LDL کولیسٹرال، HDL کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسٹرائڈ شامل ہیں۔ ان میں LDL اور HDL اہم ہیں۔

ان میں LDL کی مقدار جب خون میں ایک حد سے تجاوز کر جائے تو یہ خون میں جمنا شروع ہوجانے کا سبب بنتی ہے۔ جس کی وجہ سے مندرجہ ذیل بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں:-

۱) سینے میں درد (انجائنا)

۲) ہارٹ اٹیک

۳) فالج یا اسٹروک

۴) ٹانگ کی نالیوں کا تنگ ہوجانا اور پیروں میں شدید درد

عوام الناس کی آگہی کیلئے جسم کے اندر مختلف اقسام کی مقدار کے لئے بعض اصول وضع کئے گئے ہیں، جن کے تحت:-

۱) مجموئی کولیسٹرول ایم جی ڈی ایل (mgdl) کی مقدار ۲۰۰ سے کم سے کم

۲) ایچ ڈی ایل (HDI) کی مقدار ایم جی ڈی ایل (mgdl) کی مقدار ۱۰۰ سے کم

۳) ایچ ڈی ایل (HDL) کی مقدار ۴۰ mgdl سے زیادہ اور ۶۰ mgdl سے کم ایل ڈی ایل (LDL) کولیسٹرول کی زیادتی درج ذیل وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے

۱) غذا میں چربی کا زیادہ استعمال مثلا گوشت کی زیادتی

۲)انڈوں کا زیادہ استعمال

۳) گھی اور روغنی غذاوں کا زیادہ استعمال

۴) جسمانی مشقت اور ورزش سے گریز

۵) خاندان میں زیادہ کولیسٹرول کا رجحان

کولیسٹرول کم کرنے کیلئے بعض طریق:

مناسب خوراک مثلا سبزیوں کا زیادہ استعمال اور گھریلو ورزش سے ایل ڈی LDL کولیسٹرول کو حد سے بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ۳۵ سال کی عمر کے بعد غذاوں میں بہت احتیاط اور پرہیز بہت ضروری ہے۔

کولیسٹرول بڑھنے کی علامات:

بظاہر جسم پر اس کی کوئی واضح علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ تاہم اس کی مقدار صحیح تعین لیبارٹری ٹیسٹ کے بعد لگایا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض مریضوں میں کولیسٹرول کی زیادتی سے کہنیوں، ٹخنے اور ہتھیلیوں میں پیلے رنگ کے ابھار سے بن جاتے ہیں۔

اگر آپ کے خاندان میں موروثی طور پر کولیسٹرول بڑھ جانیکا رجحان موجود ہے تو ۳۵ سال کے بعد باقائدگی سے ٹیسٹ کرواتے رہیں۔ نیز جن چیزوں سے کولیسٹرول میں ضافہ ہوتا ہے، مثلا گوشت میں کپورے، جگر، مغز، انڈے کی زردی، بیکری کی اشیاء، تلی ہوئی چیزیں وغیرہ کے استعمال سے پرہیز کریں۔

اپنی غذائی عادات میں تبدیلی لائیں اور اپنے وزن کو اعتدال میں رکھیں۔ اسے ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ویسے بھی یہ مقولہ تو ہمارے کانوں میں بالعموم پڑتا ہی رہتا ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ (بشکریہ "ماہنامہ مصباح ربوہ)

بدترین مولویوں کی خصلت

"مولوی لوگ اپنے نفسانی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور دعوت اسلام کی نہ لیاقت رکھتے ہیں نہ اسکا کچھ جوش نہ اسکی کچھ پرواہ۔ اگر ان سے کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ اپنی ہی قوم اور اپنے ہی بھائیوں اور اپنے جیسے مسلمانوں اور اپنے جیسے کلمہ گویوں اور اپنے جیسے اہل قبلہ کو کافر قرار دیں، دجال کہیں اور بے ایمان نام رکھیں اور فتوی لکھیں کہ ان سے ملنا جائز نہیں اور انکا جنازہ پڑھنا روا نہیں، یہ ایسے ہیں اور ویسے ہیں اور کیا کیا ہیں۔"

(روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 265 تا 266 حاشیہ)

عرفان چغتائی بنام ابوالاعلی مودودی

مودودی صاحب، طفیل محمد اور نعیم صدیقی کو ہمراہ لیکر سیرت کے ایک جلسہ میں جھنگ میں دورہ کی خبر سن کر عرفان چغتائی مدیر "قلندر"، غلام محمد صاحب رنگین مدیر "عروج" انکی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ مجلس میں چند مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلباء عبدالکریم صاحب ایم اے بی ٹی اور مولوی منظور علی صاحب مدرسہ اسلامیہ ہائی سکول گھیانہ موجود تھے۔ مدیر "قلندر" (عرفان چغتائی) کا مودودی صاحب سے مکالمہ بھی ہوا۔ جو اختصارا درج ذیل ہے۔

سوال :- آج آپ کے رفیق کار امین احسن اصلاحی کی کسی تحریر کا اقتباس ایک پوسٹر کی شکل میں نظر سے گزرا جس میں درج تھا کہ :

"مسلمانو! تم نے باطل اصولوں کی خاطر گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب کو ذبح کرایا"

مولانا! کیا وہ اصول باطل تھے جس کیلئے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو ہجرت کر کے یہاں آنا پڑا!؟

جواب :- واقعی میرے نزدیک کسی کو مہاجر کہنا، از روئے شریعت ناجائز ہے۔ کیونکہ مشرقی پنجاب کے مسمانوں کی یہ ہجرت نہیں ہے۔

سوال :- تو کیا آپ کے نزدیک مہاجرین کی جانی اور مالی قربانیوں کی کوئی قیمت نہیں؟

جواب :- نہیں، وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں۔ انہوں نے ایک خلاف دین قدم اٹھایا تھا۔ قومیت کی جنگ لڑی تھی۔ جب اسکی سزا بھگتنے کی باری آئی تو مشکلات سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کی۔

سوال :- گستاخی معاف، کیا آپ بھی اسی زمرہ میں نہیں؟ پٹھانکوٹ سے بھاگ کر پاکستان آئے!؟

جواب :- خاموشی۔۔۔۔۔!!

سوال :- مسئلہ کشمیر کے متعلق اخبار میں آپ کا ذکر دیکھا ہے۔ فرمائیے کیا خیال ہے؟

جواب :- پاکستانی اس جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے۔

سوال :- خدا کیلئے کشمیر کی جنگ کے خاتمے تک اپنے فتوے کو ترجمان القرآن کے دفتر میں محفوظ رکھئے۔ جب کشمیر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہو گی آپ (بیشک) شائع کر دیں۔

... اتنے میں شام کی نماز کا وقت ہوگیا۔ نماز ادا کر کے ہم سب ان سے سلام کر کے رخصت ہوئے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے چند طلباء جو جماعت کے ارکان تھے، وہ بھی دوران گفتگو موجود تھے۔ اس کے علاوہ مودودی صاحب کے دو اور عقیدت کیش جناب عبدالکریم صاحب ایم اے بی ٹی اور محترم مولوی منظور علی صاحب اساتذہ اسلامیہ ہائی سکول جھنگ گھیانہ بھی شریک صحبت تھے۔ ان اساتذہ کی تمام تر عقیدت ختم ہوئی - اور ایڈیٹر "عروج" سے جب میں نے چلتے چلتے گھوم کر پوچھا: بتائیے رنگین صاحب! مودودی صاحب کیسے ہیں؟ نمکین صاحب نے سنہرے فریم والی عینک، ناک کے بانسے پر جماتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ع

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں کا نہ نکلا!

(اخبار "نوائے وقت" - 29/اگست 1948)

(مرسلہ: ملک محمد صفی اللہ خان، ٹورانٹو)

تبصرہ از "المنار":- محاذ کشمیر پر جب عملی جہاد کا اصل مرحلہ (یعنی 1948ء) آیا تو یہی تمام "کاغذی شیر" (جماعتے، جمعیت والے وغیرہم) اپنی اپنی کمین گاہوں میں جا دبکے تھے۔ صرف جماعت احمدیہ کے نوجوانوں پر مشتمل "فرقان بٹالین" نامی مجاہد فورس ہی تھی جس نے محاذ کشمیر پر داد شجاعت دیکر آزاد کشمیر کے علاقے میں شجاعت، بہادری اور فتح و نصرت کی نئی داستانیں رقم کر دی تھیں۔ گویا... ع

اٹھا نہ کوئی اس فرقہء زہاد سے کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

میرا سفر فلسطین

منیر الدین عبید اللہ

1968تا1972 میرے والد حافظ بشیر الدین عبید اللہ مرحوم کبابیر شہر حیفہ اسرائیل میں بطور مبلغ سلسلہ احمدیہ اپنا فرض ادا کرتے رہے ۔ مکرم فلاح الدین عودے جوسکول ٹیچر تھے اور جماعت کے نیشنل سیکرٹری بھی تھے والد صاحب کے ساتھ بڑھ چڑھ کر تبلیغی مساعی میں مدد کیا کرتے تھے۔

مکرم فلاح الدین عودے کینیڈا میں بھی جامعہ احمدیہ ٹورنٹو میں عربی زبان پڑھانے کے لیے چند سال کے لیے تشریف لائے تھے اس دوران خاکسار کی ان کے ساتھ دوستی ہوگئی اس لیے مجھے بڑا زور دے کر کہا کرتے تھے کہ آپ کے والد صاحب مرحوم کبابیر میں رہے ہیں آپ کو بھی ہمارے جلسہ سالانہ پر آنا چاہیے۔

چنانچہ گزشتہ سال جولائی کے مہینے میں خاکسار نے فلسطین جانے کی تیاری کر لی تا کہ ان کے جلسہ سالانہ میں شرکت کرسکوں۔ اس کے لیے کبابیر سے مجھے جلسہ سالانہ میں شمولیت کی دعوت کا خط آ گیا جو امیر جماعت کینیڈا مکرم ومحترم جناب ملک لال خان صاحب کو دیا اور اس کی کاپی رکھ لی جو اسرائیل پہنچنے پر ایئر پورٹ پر امیگریشن کو دکھانی تھی تا وہ زیادہ سوال و جواب نہ کریں۔محترم امیر صاحب نے حضور ایدہ اللہ تعالی بنصرہ العزیز کی اجازت سے خاکسار کو جلسہ سالانہ کبابیر میں بطور نمائندہ کینیڈا کا خط بھی دے دیا جو مَیں نے امیر جماعت کبابیر کو دیا۔ خاکسار کینیڈا سے انگلینڈ اپنے بھائی نصیر الدین عبید اللہ کے پاس دو دن کے قیام کے بعد اسرائیل روانہ ہوگیا اور تل ابیب کے ایئر پورٹ پر اترا۔انہیں انویٹیشن کا خط دکھایا تو انہوں نے فوراً کلئیر کر دیا جبکہ عرب ملکوں سے آنے والوں کو باوجود دعوت کا خط دکھانے کے ایک گھنٹے تک تفتیش کرتے ۔ مجھے وہاں کے دوست تل ابیب ایئر پورٹ پر لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ایئر پورٹ سے حیفہ شہر کبابیر پہنچے جس میں دو گھنٹے لگے۔ راستے میں بڑے خوبصورت مناظر تھے اور دو گھنٹے کے سفر کے دوران راستے میں بہت زیادہ صفائی دیکھنے میں آئی۔ کبابیر احمدیہ مسجد دو میناروں کے ساتھ بہت خوبصورت مسجد ہے جب مسجد پہنچا تو کثیر تعداد میں جماعت کے افراد استقبال کے لیے کھڑے تھے انہوں نے وہ کمرہ جس میں والد صاحب مرحوم رہا کرتے تھے میرے لیے تیار کیا ہوا تھا چنانچہ 10 دن مَیں وہیں رہا۔میرے کمرے کے ساتھ ہی گیراج تھا جس میں انہوں نے بتایا کہ میرے والد صاحب مرحوم اپنی کار پارک کیا کرتے تھے۔ مکرم محترم شریف عودے صاحب امیر جماعت کبابیر کے علاوہ تمام نیشنل مجلس عاملہ کے لوگ میرے ساتھ گھل مل گئے اور انتہائی عزت سے محبت سے پیش آئے، گویا عرصہ سے مجھے جانتے ہیں اور مجھے جو سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ ابا جان مرحوم کی خدمات کے عوض تھا ورنہ میری کیا حیثیت تھی مکرم امیر جماعت کبابیر نے خاکسار کی تقریر عربی میں رکھی ہوئی تھی جس کی تیاری کینیڈا سے ہی کر کے گیا تھا۔عربوں کے لہجے میں تقریر کرنے کی بہت زیادہ مشق کرنی پڑی۔بہت سے لوگوں نے جلسہ سالانہ کے بعد تقریر پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد دی، الحمد للہ۔

اب میں چند باتیں ان کے جلسہ سالانہ کے بارہ میں بتاتا ہوں۔

1۔ جو ہمارے جلسہ سالانہ ہوتے ہیں ان سے کبابیر والوں کا جلسہ سالانہ بالکل مختلف ہوتا ہے کیونکہ گرمی بہت ہوتی ہے اس لیے جلسہ شام سات بجے تھا 12 بجے تک چلا جاتا ہے۔

2۔ جلسہ سالانہ کا پہلا دن جمعرات کا دن ہوتا ہے اس دن یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت دی جاتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ یہودی اور عیسائی قریب 700 کی تعداد میں شرکت کرتے ہیں جوں جوں مہمان آتے جاتے ہیں پہلے ان کو کھانا پیش کیا جاتا ہے۔مسجد کے ساتھ ہی بہت بڑا صحن ہے جس میں کھانے کے میز لگے ہوتے ہیں مہمان وہاں کھانا کھا چکتے ہیں تو میزوں کو اٹھا لیا جاتا ہے اور کرسیاں جلسہ سالانہ کے لیے لگائی جاتی ہیں سٹیج پہلے سے سجایا گیا ہوتا ہے کھانے کے بعد جلسہ شروع ہوتا ہے پہلے دن اکثر تقاریب ہیرو زبان میں ہوتی ہیں اکثر ہائی لیول کے لوگ عیسائی اور یہودی اپنے خوبصورت لباس پہن کر آتے ہیں۔فوٹو گرافی اور میل

ملاپ مردوں عورتوں کا خوب ہوتا ہے خاکسار چھٹی روڈ میں بیٹھا ہوتا تھا تو جماعت کا کارکن مجھے اٹھا کر پہلی رَو میں جہاں خصوصی مہمان ہوتے تھے، وہاں بٹھا دیتا تھا۔

3۔ جلسہ کا دوسرا دن جمعہ کا دن عام مسلمانوں کا ہوتا ہے اس دن تقریریں عربی زبان میں ہوتی ہیں حیرت کی بات ہے کہ اس دن غیر احمدی مسلمان بھی 700 کی تعداد میں آجاتے ہیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کو اس لیے جمعرات کو بلایا جاتا ہے کہ یہودیوں نے بروز ہفتہ جو ان کا سبت کا دن ہوتا ہے نہیں آنا ہوتا اور عیسائیوں نے اتوار کے دن نہیں آنا ہوتا۔ یہ دن ان کا عبادت کا دن ہوتا ہے۔

4۔ تیسرا دن بروز ہفتہ احمدیوں کا جلسہ ہوتا ہے جو ہزار کی تعداد میں اس سے آتے ہیں۔ اس دن خاکسار کی تقریر تھی۔ دوست پوچھتے ہیں کہ تقریر کا موضوع کیا تھا۔ مَیں بتاتا ہوں کہ وہ واقعات میں نے جمع کیے تھے جو میرے والد محترم مرحوم اپنے قیام کے دوران کبابیر جماعت کے مرد و زَن کے بارے میں اور بچوں کے بارہ میں لکھا کرتے تھے۔ گویا تقریر میں انہی کی باتیں اور انہی کی تعریفیں میری تقریر کے ذریعہ سن رہے تھے۔ تقریر میں آخر پر کینیڈا میں جماعتی کاوشوں کا ذکر تھا۔ عام طور پر مقرر جب تقریر ختم کر لیتا ہے تو جا کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے خاکسار نے تقریر ختم کی تو امیر جماعت مکرم شریف عودے صاحب کھڑے ہو گئے، مجھ سے معانقہ کیا، مبارکباد دی ،اور پھر وہاں کے مربی سلسلہ جو قادیان جامعہ کے پڑھے ہوئے ہیں مکرم شمس الدین صاحب نے کھڑے ہو کر معانقہ کیا، مبارکباد دی، جب جلسہ ختم ہوا تو بہت لوگ ملے، وہاں چومنے کا بھی رواج ہ۔ مبارکباد دیتے ہیں اور چومتے ہیں جلسہ سالانہ کے بعد ایک مربی جو کبابیر جماعت سے ہیں ان کا نام مکرم عباد الدین المہدی کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی کہ مجھے اور میرے ساتھ تین احمدی جرمن دوست جو جرمنی سے آئے ہوئے تھے ان کو سیر کرانی ہے، چنانچہ ہم دو تین دن سیر کرتے رہے مختلف لوگ سیر کے بعد گھر لے جاتے تھے۔ بیت المقدس کے علاوہ بہت سے مقامات کی سیر کی۔غزہ جس کی یہودیوں نے تباہی پھیر دی ہے وہاں کے بارڈر تک دو گھنٹہ کے سفر کے بعد پہنچے۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو تیرے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کری

اس زمانہ کے مسلمان اور اُن کے لیڈر

ترے اسلام پر کیونکر ہو شیدا کوئی اے مسلم
جو نقشہ پیش تو کرتا ہے وہ تصویر الٹی ہے
مسلمانو! تمہاری سعی کیسے بار آور ہو
ادھر تدبیر الٹی ہے، اُدھر تقدیر الٹی ہے
مرض بڑھتا ہی جاتا ہے خدارا ہوش میں آؤ
دوا الٹی نہیں ہے گر، تو کیوں تاثیر الٹی ہے
امور دین میں کیا موت پڑتی ہے تجھے واعظ
کہ سارے کام سیدھے ہیں مگر تفسیر الٹی ہے
ترے پند و نصیحت سے مرا دل اور رُکتا ہے
سمجھ اُلٹی ہے میری یا تری تقریر اُلٹی ہے
دل و سر جب تلک سیدھے تھے، سیدھی بات تھی تیری
اب الٹے ہیں تو الٹا قول ہے، تحریر الٹی ہے
خدایا! خواب کی صورت میں یہ نقشہ بدل دے تُو
کھلے جب آنکھ تب معلوم ہو تعبیر الٹی ہے

(حضرت مرزا بشیر احمد صاحب۔ کلام بشیر ایڈیشن 1963ء صفحہ 17)

حلفیہ بیان

مجلس احرار کے سابق جنرل سیکرٹری جناب سیفی کاشمیری کا حلفیہ بیان

"خدا واحدہ لاشریک کی قسم کھا کر جس کی جھوٹی قسم کھانا لعنتی کا کام ہے۔ قطعی اور یقینی طور پر کہتا ہوں کہ مجلس احرار کی مرزائیت یا قادیانیت کے خلاف تمام تر جدوجہد اور قادیانیت کے خلاف یہ سب پراپیگنڈا محض مسلمانوں سے چندہ وصول کرنے اور کونسل کی ممبری کے لیے ان سے ووٹ لینے کے لیے ہے۔"

(اخبار زمیندار ۲۸۔اگست ۱۹۳۶)

اذکرو موتکم بالخیر

مولانا مبارک احمد نذیر صاحب کا ذکر خیر

ایک سابق رکن ٹکوسا کینیڈا

تحریر: منیر الحق شاہد

مولانا بھائی مبارک احمد نذیرؔ صاحب 8 مارچ 2022ء کو داغِ مفارقت دے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ آپ میرے دوست اور ہم جماعت بشارت احمد نذیر کے بڑے بھائی تھے۔ اس ناطے میرے بھی بڑے بھائی ہوئے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ مَیں نے اُنکے مجاہد والد حضرت مَولانا نذیر احمد علی صاحب مرحوم اور اُن کے صحابی دادا حضرت بابو فقیر علی مرحوم کو بھی اپنے بچپن میں دیکھا ہوُا ہے۔مَولانا نذیر احمد علی صاحب مرحوم کی تاریخ پیدائش اگرچہ 10 فروری 1905ء بیان کی جاتی ہے ۔ لیکن ان کے ابّا کی تاریخ بیعت کے ضمن میں صرف سال 1905ء ہی رقم ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے دادا تو صحابی تھے لیکن بشارت نذیر کے مطابق نہ تو ان کے والد یا دادا جان نے کبھی مَولانا نذیر احمد علی صاحب کے بارہ میں کہا کہ وہ بھی صحابی تھے۔ بہر حال صحابی نما تو ضرور تھے۔

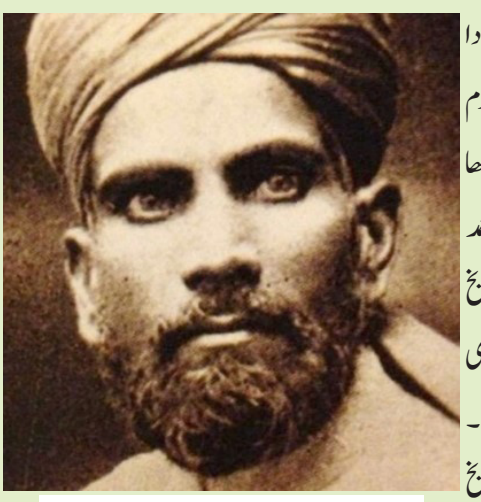

حضرت مولانا نذیر احمد علی صاحبؓ

مبارک نذیر صاحب اور میری عمر میں بارہ سال کا فرق تھا۔ کیونکہ اُن کا چھوٹا بھائی بشارت نذیر صاحب ان سے اسی قدر چھوٹا ہے اور وہ میرا ہم عمر اور ہم جماعت رہا ہے۔ اوّلین کچّے مکانوں کی رہائش کے بعد ہم تحریکِ جدید کے کوارٹرز میں آ گئے تھے۔ جو لوگ اوّلین کوارٹرز کو جانتے ہیں، ان کو یاد ہوگا کہ یہ دو دو کوارٹرز کا جوڑا ہوتا تھا۔شروع کے تقریباً آدھے کوارٹرز میں آدھا برآمدہ اندر کی طرف اور آدھا برآمدہ باہر کی طرف تھا۔ بقیّہ کوارٹرز میں پورا برآمدہ اندر کی طرف تھا۔جن کوارٹرز میں برآمدہ دونوں طرف تھا وہ تعداد میں 30 تھے اور ایک تا پندرہ کا رُخ تحریکِ جدید کے دفاتر کی جانب تھا اور بقیّہ سولہ تا تیس گول بازار کے عقب میں کھلتے تھے۔ ہمارے کوارٹر کا نمبر 30 تھا۔ وہاں سے انجمن کے دفاتر کی طرف چلیں تو مَولانا صاحب کا کوارٹر چھ قوارٹر بعد آتا تھا۔ اس طرح نمبر 23 بنتا ہے۔ ہمارے بعد کے کوارٹر میں بدر سلطان اختر صاحب رہتے تھے اور مَولانا نذیر احمد علی صاحب کے کوارٹر سے پہلے مَولانا محمد صادق سماٹری صاحب کی فیملی رہتی تھی۔

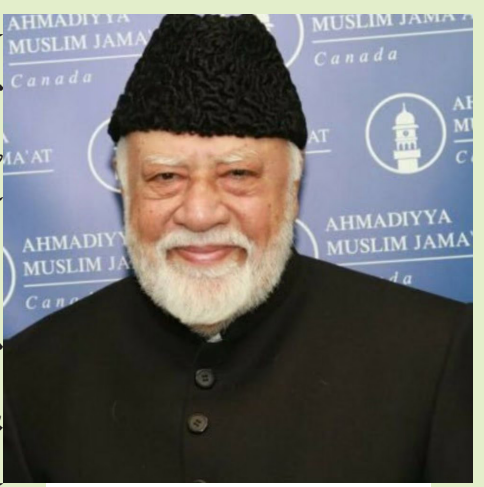

مولانا مبارک احمد نذیر صاحب

اُن دنوں کی یادوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اُن کو عصر کے قریب فٹبال کی یونیفارم پہنے کالج کی گراؤنڈز کی طرف کھیلنے جاتا فخر سے دیکھتے تھے۔ کالج سے فراغت کے جلد بعد آپ سیرالیون کے سکولوں میں پڑھانے چلے گئے اور بو اور بواجے بو وغیرہ شہروں میں خدمات سرانجام دیں۔ اُس دَور میں آپ نے داڑھی نہیں رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے بعد آپکو میں نے کینیڈا میں ہی دیکھا۔ میں تو کینیڈا میں 1987ء میں پہنچا اور آپ غالباً 1988ء میں تشریف لائے۔ بچپن کے دنوں میں ربوہ میں آپ کے والد گرامی حضرت مَولانا نذیر احمد صاحب علی کو بھی دیکھنے کی میری ایک سہانی یاد ہے۔ یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب آپ آخری مرتبہ سیرالیون سے پاکستان تشریف لائے۔ ایک دن میں بشارت کے ساتھ دوپہر کے قریب انکے گھر پہنچا تو کیا دیکھا کہ مَولانا صاحب بیٹھک میں کھڑے تھے۔ ہاتھ میں ایک تھالی تھی جس میں کچھ انگور کے دانے تھے جو آپ کھا رہے تھے۔ آپ نے جب مجھے اور بشارت کو آتا دیکھا

تو ہمیں سلام کیا اور تھالی جس میں چند ہی دانے باقی رہ گئے تھے، اپنے بیٹے منیر احمد نذیر کو جو وہاں بیٹھک میں ہی مَوجود تھے، دے دی۔ بشارت نے اس پر کچھ ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا۔ میرے ذہن نے اس واقعہ کو کسی اور رنگ میں قبول کیا کہ گھر میں آپ کا ایک خاص رعب اور احترام ہے۔ آپ ایک وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ اچھّے قد کاٹھ کے مگر منحنی جسم کے تھے جو دیکھنے میں دل کو بھاتے تھے۔ چہرہ آپکو اللہ نے بہت پُر رعب دیا ہوُا تھا کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر زیادہ دیر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ یقیناً اس رعب کا افریقنز پر بھی ضرور اثر پڑتا ہوگا جب آپ انکو تبلیغ کرتے ہونگے۔ آپکی خدمات اور طرزِ تبلیغ کا بعد کی زندگی میں جب تفصیلی علم ہوُا تو خوشی کا موجب بنا۔ اللھم اغفرلہ و اعلیٰ مثواہ فی جنّۃ النعیم۔

بچپن کے دنوں میں تحریکِ جدید کے کوارٹرز کے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ ہم اکثر غلیل کے ذریعہ پرندوں کے شکار پر نکل جاتے۔ بشارت، اسکے بھائی اور بعض دوسرے دوست بھی ساتھ ہوتے۔ ایک دو مرتبہ ہم شکار کرتے قریبی قصبہ احمد نگر تک جا پہنچے جہاں بشارت کے دادا جان محترم بابو فقیر علی صاحب صحابی ؓ رہائش پذیر تھے۔ نہ صرف ان سے ملاقات ہو جاتی اور ایمان افروز باتیں سننے کا موقعہ ملتا بلکہ ایک دو دفعہ اپنا شکار بھی وہاں پکانے کی یاد اب بھی دل کو گدگداتی ہے۔ حضرت بابو فقیر علی صاحب قادیان کے پہلے ریلوے سٹیشن ماسٹر تھے۔ انتہائی نورانی چہرہ، دھیمی طبیعت کے مالک اور ولی اللہ انسان تھے۔ اللھم اغفرہ و ارحمہ و اعلی درجاتہ فی جنّۃ الفردوس۔ آمین۔

مولانا مبارک احمد نذیر صاحب جب کینیڈا تشریف لائے تو آپ کو پہلے ویسٹرن کینیڈا میں مبلغ بنا کر وینکوور بھجوا دیا گیا۔ وہاں ان سے پہلے میری والدہ کے ماموں کرنل محمد سعید صاحب متعیّن تھے جو وہاں جانے سے پہلے سیکریٹری مشن ہاؤس تھے۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح بغیر جامعہ کی تعلیم کے، بعد از ملازمت زندگی وقف کئے جانے پر مبلغ بنا دے گئے تھے۔ مبارک صاحب غالباً وہاں سے ایسٹرن کینیڈا کے مبلغ کے طور پر آٹوا بھجوا دئے گئے۔ اُن دنوں مَیں نیشنل سیکریٹری تربیت تھا اور ہمارے بعض عاملہ کے اجلاس مختلف مشن ہاؤسز میں ہوتے تھے اور ایک اجلاس آٹوا میں بھی رکھا گیا۔ اُن دنوں آٹوا مشن ہاؤس شہر سے کچھ باہر ایک فارم ہاؤس میں تھا جسکے ساتھ کافی کھلی زمین تھی۔ اس زمین کا کچھ حصہ کسی کاشت کار کو کاشت کے لئے دیا ہوُا تھا جو کچھ حصّہ پر جماعت کے لئے بھی کاشت کر دیتا تھا۔

چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو آپ نے ہم سب کے لئے بہت سے بھُٹے اتروا کر بھون کر پیش کروائے۔

آٹوا کے بعد آپ کو غالباً جامعہ احمدیہ کینیڈا کا پہلا پرنسیپل مقرر کیا گیا۔ آپ نے مجھے تحریک کی کہ میں اپنا ذاتی کتب خانہ جامعہ کے لئے پیش کروں۔ میں نے عرض کیا کہ سب تو ابھی پیش نہ کرسکوں گا کہ مَیں اور گھر والے ان کتب کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میں اپنی لائبریری کی پانچ مضبوط شیشے کے دروازوں والی الماریاں ضرور پیش کر دوں گا جو مَیں نے کر بھی دیں کیونکہ ان ہی دنوں میں مَیں نقل مکانی کر کے مسجد بیت الاسلام کے قریب جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے وہاں کی ضرورت کے مطابق اور الماریاں خرید لیں۔ بعد ازاں میں نے کچھ کتب جامعہ لائبریری کو پیش بھی کیں۔

جب حضور نے غالباً ۲۰۰۹ میں امیر اور مشنری انچارج کا عہدہ علیحدہ علیحدہ کیا تو مَولانا نسیم مہدی صاحب جو پہلے امیر اور مشنری انچارج تھے، صرف امیر رہنے دئے گئے اور مبارک بھائی کو مشنری انچارج مقرر کر دیا گیا۔ جس ذمہ داری کو آپ نے نہایت عمدگی سے نبھایا۔ آپ اُردو اور انگریزی زبان کے قادر الکلام مقرّر تھے۔ آپ بہت بذلہ سنج انسان تھے اور ہنسی مذاق میں بعض ضروری باتیں کہہ دیا کرتے تھے۔ اسی لئے لوگ آپکے خطاب کو سننا بہت پسند کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بیٹے کے نکاح کے اعلان کے مَوقعہ پر جب آپ حق مہر کے مقام پر پہنچے تو رُک کر بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا؛ 'یہ رقم بیوی کو دینی بھی ہے'۔ آپ نے اپنے بڑے نواسے کو پہلے جامعہ میں داخل کرایا لیکن اس کا رجحان وہاں کا نہ تھا چنانچہ وہ اپنی ٹیکنیکل فیلڈ میں چلا گیا۔ چھوٹے نواسے ندیم کی شادی میری ایک کزن سے ہوئی جو حضرت مَولانا ابو العطاء صاحب کی نواسی ہیں۔ اس طرح سے رشتہ داری بھی ہوگئی۔ باتیں تو اور بھی ہیں لیکن سر دست انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

دعا ہے کہ مَولا کریم ان سے محبّت اور رحم کا سلوک فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ سب پسماندگان کا خود حافظ و ناصر ہو اور انکو مَولانا صاحب کی نیکیوں کو جاری رکھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین اللھم آمین

باتیں حضرت قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم کی

چوہدری نصیر احمد (کینیڈا)

اذکروا موتکم بالخیر کے تحت دوست احباب اپنے بزرگوں والدین اور دیگر اقارب کی زندگیوں کے بارہ میں مضمون شائع کرواتے رہتے ہیں۔ جب بھی کبھی ایسا مضمون نظر سے گزرتا ہے تو میری نظر حضرت پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ مدت سے یہ خواہش دبی رہی اور بوجہ مصروفیات زندگی اس کو عملی جامہ نہ پہنچا سکا۔ چند روز سے پھر سے اس خواہش نے شدت پکڑی ہے اور اس خیال سے بھی کہ حضرت قاضی صاحب مرحوم کا وجود ایسا نافع الناس تھا کہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں احباب کسی نہ کسی رنگ میں اُن سے مستفیض ہوئے۔ ایک لمبا عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور جیسے مشہور تعلیمی ادارے سے منسلک رہے اور پرنسپل کا عہدہ پایا۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر بھی رہے۔ حکومت کے اعلیٰ تعلیمی عہدے بھی حاصل کئے اور اخیر میں مختصر عرصہ کے لئے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرنسپل بھی رہے۔ جلسہ سالانہ ربوہ کے اجلاسوں کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اِن تمام ادوار میں قاضی صاحب مرحوم کے وجود سے ہزاروں طلباء (جن میں سے ماشاء اللہ سینکڑوں احباب آج کل اہم سرکاری اور غیر سرکاری افسران کا درجہ پاتے ہوں گے) فیض یافتہ ہوئے۔ ویسے تو ان کا پسندیدہ مضمون فلسفہ و نفسیات تھا لیکن شخصیت ایسی جامع تھی کہ ہر مضمون سے تعلق رکھنے والا طالب علم ان کے وجود سے نفع حاصل کر سکتا تھا۔

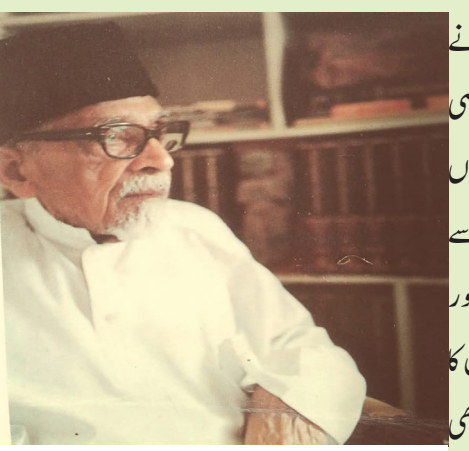

مکرم قاضی محمد اسلم صاحب

ایسے نفع بخش وجود کے بارے میں کچھ لکھنا بعض ایسی باتیں محفوظ کرنے کا موجب ہو گا جو اُن کی شخصیت کے بعض لطیف پہلو اجاگر کرتی ہیں اور اس سے بڑھ کر ہم تاریخ میں یہ بھی محفوظ کر سکیں گے کہ کیسے کیسے مایہ ناز سپوت احمدیت کا خادم بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طریقہ سے ہم ایک طرح کا شکریہ ادا کر سکیں ان خدمات اور فوائد کے بدلہ میں جو ہم نے اُن کی زندگی سے حاصل کئے۔

تعلیمی اداروں کو شہرت، فخر اور وجہ امتیاز بعض وجوہ کی بنیاد پر ہوتا ہے مثلاً یہ کہ فلاں ادارہ اتنی مدت سے خدمت کے فرائض انجام دے رہا ہے یا کونسی مشہور شخصیت اس ادارہ سے منسلک رہی ہے یا پھر یہ کہ اس کی عمارت اتنی قدیم یا جدید ہے۔ مثلاً پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی کو اپنے تعلیمی معیار میں قدیمی روایات سے خواہ کسی قدر دوری ہی کیوں نہ ہو لیکن ایشیاء کی یہ ایک مشہور درس گاہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا حال کتنا ہی پتلا کیوں نہ ہو لیکن اس کے قیام کی تاریخ اپنی مخصوص وجہ امتیاز رکھتی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملنا ایک وقت میں قابلیت کا ایک معیار تصور ہوتا تھا۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ اپنی شہرت، فخر اور وجہ امتیاز اِس بات سے حاصل کرتا ہے کہ اس کے قیام میں اور چلانے میں ایسی بے لوث اور خدا رسیدہ ہستیاں کارفرما رہیں ہیں جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قابلیت اور عظمت کی پیشن گوئیاں کیں اور اپنے وعدوں کو خوب نبھایا۔ اپنے قیام سے لیکر ایک لمبے عرصہ تک یہ ادارہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الثالث نور اللہ مرقدہٗ) کی سرپرستی میں رہا۔ آپ کے امام جماعت احمدیہ کے انتخاب کے بعد یہ اہم ذمہ داری حضرت قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم کی خدمات سلسلہ احمدیہ میں اضافہ کا موجب بنی۔ آپ کی شخصیت کسی مخصوص تعارف کی محتاج نہیں۔ ہزاروں لوگ جن کا جماعت احمدیہ سے تعلق بھی نہیں آپ سے متعارف ہی نہیں بلکہ معترف ہیں۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا حکومت کی تحویل میں جانے سے قبل طوطی بولتا تھا۔ یہ اہم ادارہ نہ صرف جماعت احمدیہ کے طلباء کے تعلیم و تربیت پر کمر بستہ تھا بلکہ غیر از جماعت طلباء کثیر تعداد میں اس میں داخلہ لیتے۔ کالج کے اِس معیار کو پیدا کرنا اور اس شہرت کو حاصل کرنا دیانتدار اور بے لوث خدمت گار اساتذہ کی قربانیوں کا نتیجہ تھا۔ اِن واقفین اساتذہ کی قابلیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے واسطے یہ ضروری تھا کہ اس ادارہ کی سربراہی ایسے اشخاص کے پاس ہو جو اپنے تجربہ اور علم میں اپنی مثال آپ ہوں۔ اس لئے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی نظر جماعت احمدیہ کے امام منتخب ہونے

کے بعد اس ادارہ کی سرپرستی کے واسطے حضرت قاضی محمد اسلم مرحوم پر پڑی۔ مرحوم اپنے تجربہ اور علم اور شخصیت کے لحاظ سے اپنی واحد مثال تھے۔

۱۹۶۸ میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تو حضرت قاضی صاحب مرحوم ٹانگ کے ٹوٹنے کے باعث لاہور میں صاحب فراش تھے۔ نئے طالب علموں کو اپنے نئے ماحول اور ادارہ کو سمجھنے اور واقفیت پیدا کرنے کے واسطے ایک خاصی جستجو ہوتی ہے اس لئے دیگر طلباء سے اپنے اساتذہ کے بارہ میں سوالات کرنا ایک جزو لازم کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمرہ میں پرنسپل کی شخصیت بھی زیر بحث آتی ہے۔ نتیجۃً نئے طلباء جلد ہی کالج کی اہم شخصیتوں کے بارہ میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس تگ و دو کے نتیجہ میں حضرت قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کا جو تصور میرے ذہن میں ابھرا اس نے خواہش ملاقات میں شدت پیدا کر دی۔

میرا قیام فضلِ عمر ہوسٹل میں تھا جس کے انچارج چوہدری محمد علی صاحب تھے۔ آپ تھے تو فلسفہ کے پروفیسر لیکن رعب انگریزی زبان میں فراوانی کی وجہ سے تھا چوہدری صاحب طلباء کی اس کمزوری کو خوب جانتے تھے اسی وجہ سے انتظامی معاملات کو سلجھانے میں انگریزی زبان کا حربہ اکثر استعمال کرتے۔ اس بات کا تو علم نہیں کہ انگریزی زبان انصاف کے تقاضے کس حد تک پوری کرتی لیکن وقتی طور پر امن امان قائم کرنے کا یہ ایک موثر ہنر تھا۔ شاید انگریز قوم بھی برصغیر ہند پر اسی ہنر کی فوقیت کی بنا سو سال حکومت کر گئی۔ انگریز کے انصاف کے قصّے تو بہت مشہور ہیں، بعض اوقات خیال آتا ہے کہ شاید ان کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہ ہو۔ بہرحال چوہدری صاحب نے فضلِ عمر ہوسٹل کے معاملات میں انگریزوں کی تاریخ سے ضرور کچھ فائدہ حاصل کیا ہے۔ اِن وجوہات کی بنا پر حضرت قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کا جو تصور ابھرا تھا وہ نہایت ہی بھلا معلوم ہونے لگتا اور اندر ہی اندر ان کے انتظار کی آگ دبی دبی سلگنے لگتی۔ اور پھر شدتِ انتظار اکثر دعا میں تبدیل ہو جاتا۔ اللہ کرے قاضی صاحب جلد صحت یاب ہوں اور واپس آئیں۔ غالباً غیر دانستہ طور پر اس خیال سے تقویت پہنچتی کہ چوہدری صاحب اور صوفی صاحب سے بھی آگے ایک مقام قاضی صاحب کا ہے جہاں کبھی ہماری رسائی بھی ہو گی۔

حضرت قاضی صاحب مرحوم کو صحت یاب ہوتے اور واپس کالج آنے تک ہم ایک سال کا عرصہ کالج اور ہوسٹل میں گزار چکے تھے اور اس تجربہ سے ہوسٹل میں رہنے کے کچھ داؤ پیچ معلوم ہو چکے تھے۔ اپنے پرنسل کو دیکھنے اور ملنے کا شوق تو پہلے سے ہی موجوں پر تھا۔ ہوسٹل میں رہنے والے طلباء کو ایک مزید فائدہ یہ ہوا کہ حضرت قاضی صاحب مغرب کی باجماعت نماز ادا کرنے کی غرض سے روزانہ ہوسٹل تشریف لاتے اور آدھ گھنٹہ، گھنٹہ طلباء کی غیر رسمی محفل میں مختلف باتیں کرتے۔ اس طرح ''استاد شاگرد'' کے مخصوص رشتہ اور ماحول سے علیٰحدہ ایک گھریلو سماں پیدا ہوتا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قاضی صاحب بھی ہماری طرح ہوسٹل میں رہتے ہیں اور وہ دوری جو پرنسپل کا عہدہ اپنے ساتھ لاتی ہے دور ہو جاتی۔ قاضی صاحب مرحوم کچھ اپنی طبیعت کے لحاظ سے اور کچھ عمر کے تقاضہ کے پیش نظر دھیمی آواز سے گفتگو کرتے اس لئے میری خواہش رہتی کہ ان کے قریب بیٹھنے کی جگہ ملے۔ ٹانگ ٹوٹنے کے باعث ضعف اور کمزوری ابھی باقی تھی اس لئے مغرب کی نماز کے بعد چند طلباء پرنسپل کی کوٹھی تک ان کے ساتھ چلتے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اور دھیمے لہجہ میں فلسفیانہ باتیں کرتا ہوا یہ مختصر سا قافلہ کوئی پندرہ منٹ میں پرنسپل کی کوٹھی تک پہنچتا (ویسے یہ فاصلہ کوئی تین منٹ کا ہو گا)۔ جب کبھی ٹانگ پر بوجھ محسوس ہوتا قاضی صاحب مرحوم کسی ساتھی طالب علم کے کندھے کا کچھ دیر کے لئے سہارا لے لیتے۔ ایک عجیب سماں ہوتا کالج کا پرنسپل اپنے طلباء کے ساتھ یوں گھل مل جاتا جیسے وہ اس ادارہ کا سربراہ نہیں بلکہ ہزاروں طلباء میں سے ایک طالب علم ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کا یہ ایک نہایت ہی سادہ اور لطیف پہلو تھا۔

قاضی صاحب مرحوم کا بعد نماز مغرب کا یہ مختصر سا قافلہ اکثر اوقات سینئر طلباء پر مشتمل ہوتا اور ہر چند میری خواہش ہوتی لیکن موقع نہ ملتا۔ ایک دن بعد نماز نوٹس بورڈ کے قریب کھڑا تھا کہ اچانک قاضی صاحب ایک طرف سے اکیلے ہی نمودار ہوئے اور میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ اور پھر فرمانے لگے کہ چلو گھر کی طرف چلتے ہیں، مجھے وہاں تک چھوڑ آؤ۔ میں ساتھ ہو لیا جیسے انتظار ہی کر رہا تھا کہ آج تو موقع ملے گا۔ راستہ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک ایک جگہ رک گئے اور فرمانے لگے کہ ایک سوال پوچھتا ہوں، جواب دیانتداری سے دینا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو یوں گویا ہوئے، ''دیکھو میرا دماغ ٹھیک ہے؟'' اس اچانک سوال پر مجھے حیرانگی ہوئی کہ کالج کا پرنسل جو اپنی ذات میں مانی ہوئی شخصیت ہے مجھ سے کیا سوال کر رہا ہے۔ میں نے کہا قاضی صاحب یہ آپ کیا سوال پوچھ رہے ہیں؟ تو فرمانے لگے، بوڑھا ہو گیا ہوں، کبھی کبھار بھول بھی جاتا ہوں اور کبھی یہ بھی خیال آتا

ہے کہ نہ معلوم دماغ بھی ٹھیک رہا ہے کہ نہیں۔ اس لئے سوچا کہ پوچھ ہی لیتا ہوں۔ بھلا میری کیا حیثیت تھی کہ ایسی شخصیت کے دماغ کے بارہ میں اپنی رائے دیتا۔ ہم تو ان دماغوں سے کچھ سیکھنے گئے تھے نہ کہ اُن پر اپنی رائے کا اظہار کرنے، اور پھر خرابی دماغ کا جو تصور اس وقت میرے ذہن میں تھا اس کے مطابق اس امتحان میں صرف وہی لوگ پاس ہو سکتے تھے جو بازاروں میں اور گلیوں میں نیم برہنہ حالت میں منہ سے مغلظات نکالتے رہیں۔ قاضی صاحب مرحوم اِس حالت سے کوسوں دور تھے، اِس لئے ہر چند اس امتحان میں پاس نہ ہوئے۔ ایک لمبے عرصہ تک یہ واقعہ میرے ذہن میں نقش رہا کہ بالآخر قاضی صاحب نے مجھ سے ایسا سوال کیوں کیا جبکہ نہ میں ان کے قریبی احباب میں تھا اور نہ اپنی عمر اور تجربہ اور علم کی بنا پر ایسے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اُن سے رفاقت بڑھی اور ان کی طبیعت اور مزاج کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو یہ حقیقت کھلی کہ حضرت قاضی صاحب مرحوم مدرس ہونے کے علاوہ پیشہ ورانہ فلسفی بھی تھے۔ اس واقعہ کے بعد قاضی صاحب مرحوم کے قافلہ میں میری شمولیت آسان ہوگئی اور اکثر اوقات ان کی رفاقت کا موقع ملتا رہا۔ ایک دن کہنے لگے تم روزانہ میرے ساتھ گھر تک چلا کرو۔ یوں ایک سولہ سالہ طالب علم کا کالج کے ساٹھ پینسٹھ برس کے پرنسپل کے ساتھ دوستی کا آغاز ہوا جو برسوں قائم رہا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ مجھے ایک دفعہ اپنی نظر چیک کروانے لاہور جانا پڑا۔ سوئے اتفاق کہ اس غرض کے لئے ڈاکٹر بشیر احمد صاحب اور ڈاکٹر سجاد احمد صاحب کے کلینک میں چلا گیا۔ مجھے اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب قاضی محمد اسلم صاحب کے بھائی ہیں۔ جب واپس ربوہ آیا تو ہوسٹل کے کھانے کے کمرہ کے قریب قاضی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد میں نے ذکر کیا کہ گزشتہ ہفتہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا اور وجوہ سفر بھی بیان کی۔ پوچھنے لگے کونسے ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر بشیر احمد کی کلینک میں سجاد احمد نامی ایک ڈاکٹر تھے۔ یہ سن کر قدرے توقف کے بعد فرمایا ”میرے تمام بھائی پڑھ لکھ کر بڑے کام کے آدمی بن گئے نکمّا صرف میں ہی رہا“۔ میں نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر بشیر صاحب آپ کے بھائی ہیں تو فرمانے لگے ہاں، بلکہ ہمارے خاندان میں اکثر کا پیشہ ڈاکٹری ہی ہے۔ اس کے بعد کچھ سرسری تعارف اپنے خاندان کا کروایا۔ حضرت قاضی صاحب کا اپنے بارہ میں یہ بیان صریحاً کسرنفسی پر مبنی تھا۔ گو خود ڈاکٹر نہ بنے لیکن کتنے ڈاکٹر ان کے مرید ہوئے اور اس زمانہ میں جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، کتنے طلباء میڈیکل کالجوں میں گئے اور ڈاکٹر بن کے نکلے کون حساب رکھ سکتا ہے۔

میرے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے زمانہ میں قاضی صاحب کے پرنسپل ہونے کا دور بہت تھوڑا تھا۔ جلد ہی کمزوری صحت کی بنا پر ریٹائرمنٹ پر لاہور چلے گئے۔ لیکن اس مختصر عرصہ میں اپنا نقش چھوڑ گئے۔ اکثر میں ان کے دفتر میں بلا جھجک چلا جایا کرتا اور خود بھی فرمایا کرتے کہ جب کام ہو آجایا کرو، اگر دفتر نہ ہوں تو گھر آجایا کرو۔ کئی بار تو صرف محفل کی خاطر اُن کی کوٹھی پر عصر کی نماز کے بعد چلا جایا کرتا اور چائے پر محفل جمتی۔

کچھ عرصہ بعد جب میں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لیا تو قاضی صاحب سے تعلقات دوبارہ بحال ہو گئے۔ یہ زمانہ 1975-1973 کا ہے۔ اس عرصہ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک دور مئی 1974 سے پہلے کا ہے اور ایک بعد کا۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ 1974 مئی کے بعد بہت کم احمدی طلباء پنجاب یونیورسٹی میں رہ گئے اور جو رہے وہ بھی تکلیف دہ ماحول میں تھے۔ کھانے کے برتن الگ کر دیئے گئے، دھمکیاں ہر وقت ملتی رہتیں، سامان وغیرہ جو تھا وہ تو پہلے ہی سب کچھ ہنگاموں کی نظر ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار اکّا دکّا چیز کسی کے کمرہ میں نظر آتی تو لوٹ مار کے چند ماہ یاد آجاتے۔ اس دور سے تمام احمدی واقف ہیں۔ بلکہ ملک پاکستان کی تاریخ گواہ ہے۔

1974 مئی سے پہلے کا دور ایک ایسا زمانہ تھا جس میں احمدیہ انٹر کالجیٹ اسٹوڈنس ایسوسی ایشن ایک بہت فعال اور بے دھڑک تنظیم تھی، اور ہوتی بھی کیوں نہ جبکہ اس کی سربراہی ہمارے موجودہ امام حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع خود کرتے تھے۔ بنفس نفیس کئی اجلاسوں میں شرکت کرتے اور جب بھی لاہور آتے آنے کی اطلاع پہلے بھجوا دیتے تا کہ ملاقات کا ایک موقعہ نکل سکے۔ اسی دور میں مجھے بھی ایک سال اس ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری ہونے کا موقعہ ملا۔ اِس دوران متعدد مذاکرے، مختلف موضوعات پر جلسے بڑی شان سے پورے لاہور میں کئے جاتے۔ تعلیمی اداروں میں پوسٹر وغیرہ لگائے جاتے باقاعدہ دعوتی کارڈ پر موضوع جلسہ، تقریر کرنے والے علماء اور پروفیسر صاحبان کے نامِ گرامی درج ہوتے اور یہ کارڈ بکثرت طالب علموں میں تقسیم کئے جاتے اور دعوت عام دی جاتی۔ اکثر ایسے جلسے YMCA ہال واقع مال روڈ لاہور میں منعقد ہوتے اور نیو کیمپس سے پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے لئے علیحدہ بسوں کا انتظام ہوتا۔ حضرت قاضی صاحب مرحوم کی ساری زندگی طلباء میں گزری اس

لئے ان تمام سرگرمیوں میں آپ کا وجود حاضر ہوتا۔ گاہے بگاہے جب بھی کوئی مشکل امر پیش آتا حضرت قاضی صاحب بڑی دلچسپی سے ہماری مدد کرتے۔ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ ان کے ساتھ بات کرنے میں نہ تأمل ہوتا اور نہ ہچکچاہٹ محسوس ہوتی۔ اس قدر سادہ طبیعت اور مذاق تھا کہ عمر کا فرق ذرہ بھی حائل نہ ہوتا۔ اس لئے ایک بات ہمیشہ طے ہوتی کہ جلسہ کی صدارت قاضی صاحب مرحوم کے ذمہ رہتی۔ آپ نہ صرف صدارت فرماتے بلکہ تمام تقاریر کو بہت غور سے سنتے اور نوٹس لیتے رہتے۔ ایسے ہی ایک جلسہ کا انتظام کیا جس کا موضوع ''اسلام اور سوشلزم'' تھا۔حسبِ معمول صدارت قاضی صاحب کے ذمہ رہی۔ اور مقام بھی YMCA ہال ہی تھا۔مقررین میں حضرت مرزا طاہر احمد صاحب اور حضرت مولانا عبد المالک صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ ''سوشلزم'' کے موضوع پر تقریر کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انتظامات کے پروفیسر اے آر جعفری صاحب تھے۔ چونکہ یہ موضوع ایسا تھا کہ حکومتِ وقت اور اس کے سربراہ خود کو اس موضوع کا ماہر تصور کرتے اور اپنے خیال اور رائے کو حرفِ آخر کا درجہ دیتے، اس لئے طلباء میں گہری دلچسپی تھی۔ ہال سارا بھرا ہوا تھا بلکہ باہر بھی احباب کھڑے تھے۔ نہایت عمدہ تقریریں ہوئیں۔ پروفیسر جعفری صاحب ایک ہر دلعزیز شخصیت ہیں، انہوں نے تقریر بڑی پُرزور کی۔حضرت قاضی صاحب صدارت کے فرائض کے ساتھ ساتھ نوٹس لیتے رہے اور جونہی پروفیسر جعفری صاحب نے ختم کیا حضرت قاضی صاحب نے ایک کاغذ کا ٹکڑا مجھے دیا کہ جعفری صاحب کو دے دو۔ جعفری صاحب پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور صرف اتنا کہا کہ مجھے آپ سے اتفاق ہے، گو جعفری صاحب کی تقریر سوشلزم پر تھی اور قاضی صاحب کے ریمارکس اسلامی تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ صحیح الفاظ مجھے یاد نہیں رہے۔

لاہور میں حضرت قاضی صاحب کا قیام ان کی کوٹھی واقع گلبرگ میں تھا۔ جب بھی میرا اُدھر سے گزر ہوتا اکثر چلا جایا کرتا۔خود بھی کہتے کہ جب ادھر آؤ آ جایا کرو۔ اسی کمرہ میں ہوتا ہوں یا زیادہ میں زیادہ باتھ روم تک جاؤں گا۔فون وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ میرے ایک کلاس فیلو جو بہاری تھے اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد سے کچھ خانگی اور مالی پریشانیوں کا شکار رہتے تھے۔ والدین غالباً بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے تھے اور ذریعہ آمد کوئی نہ تھا۔ یہ صاحب ایک دفعہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مالی طور پر بہت تنگی ہے اور کام کی تلاش کر رہا ہوں لیکن بے سود۔نیشنل بینک میں درخواست دی ہوئی ہے اور ایک جگہ بھی خالی ہے لیکن وہاں ایک احمدی افسر ہے اگر تم سفارش کرو تو شاید کام بن جائے۔ میں تو ان احمدی افسر صاحب سے واقف نہ تھا لیکن اچانک حضرت قاضی صاحب کا خیال آیا۔ فوراً ہی ہم دونوں موٹر سائیکل پر آپ کے گھر پہنچ گئے۔ حال احوال دریافت کرنے پر پوچھا کہ کہو کس طرح آئے ہو۔ غالباً میرے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ کسی کام کی غرض سے آیا ہے۔ میں نے مدعا بیان کیا اور اپنے دوست کے تعارف میں یہ بھی بیان کر دیا کہ یہ دوست ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔فرمانے لگے کہ یہ تم نے کیسی بات کہی ہے۔ضرورت مند کی حاجت پوری کرنے کے وقت میں احمدی اور غیر از جماعت کا فرق بے معنی ہے۔ ہماری جماعت کا ایک بڑا مقصد حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے خدمتِ خلق بھی بیان کیا ہے اور اس میں مذہب اور فرقہ کی قید نہیں۔ پھر ذرا سختی سے فرمانے لگے ''دیکھو اب کبھی ایسی بات نہ کرنا''۔ میں نے وضاحتاً عرض کیا کہ قاضی صاحب میں نے تو صرف تعارف میں ایسا کہا ہے میرا مدعا فرقہ پرستی نہیں۔تو فرمانے لگے کہ حاجت کے وقت ایسے فرق کو ظاہر کرنا ایسا تأثر دیتا ہے جیسے ہم فرقہ پرستی کرتے ہیں۔ پھر میرے دوست کی طرف متوجہ ہوئے اور اس احمدی افسر کا نام پتہ پوچھا۔سن کر کہنے لگے کہ میں تو اس نام کے کسی احمدی کو نہیں جانتا۔ پھر کچھ اور کوائف پوچھے جن کا جواب ہمارے پاس نہ تھا۔ پھر فرمایا کہ لاؤ پنسل کاغذ۔ جب حاضر کیا تو اس افسر کے نام ایک سادہ سی چٹھی لکھ دی۔ میں نے کہا کہ قاضی صاحب آپ تو اس کو جانتے بھی نہیں اور چٹھی کیسے لکھ دی، تو فرمانے لگے اگر احمدی ہے اور میں نہیں جانتا تو وہ تو مجھے جانتا ہی ہو گا اور اگر گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا ہوا ہو گا تو کچھ لحاظ تو کرے گا۔ پھر فرمایا ہمارے پاس سے کوئی آدمی خالی نہ جائے، ہم نے تو اپنا فرض پورا کر دیا۔ یہ تھی حضرت قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم کی شخصیت۔

1973 کے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر میرے ساتھ تین غیر از جماعت دوست تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے (وہ تینوں آج کل حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک تو ماشاء اللہ ترقی کر کے D. C. کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں)۔ ہم میں آپس میں بحث چھڑ گئی کہ آیا پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کا عہدہ بڑا ہے یا پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا۔ گورنمنٹ کالج چونکہ ایک مشہور درس گاہ ہے جہاں ایک زمانہ میں داخلہ ملنا قابلیت کا ایک معیار تصور ہوتا تھا۔ اس لئے اس کالج کے پڑھے ہوئے طلباء اکثر بڑے فخر سے یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ہم اس کالج کے طلباء

ہیں، اور یہ احساس برتری بعض اوقات غیر ضروری طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ میرے دوست بھی غالباً اسی مرض کے پنجہ میں گرفتار تھے اور بضد تھے کہ پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اپنے عہدہ میں بہ اعتبارِ معاشرتی مقام زیادہ اہم ہے۔ اس پر یہ بات اور بڑھادی کہ اگر پرنسپل کو وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی جائی تو وہ انکار کر دے گا۔ میری رائے اس کے الٹ تھی اور دلیل یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تاریخ میں کتنی شہرت ہی کیوں نہ رکھتا ہو بہرحال یونیورسٹی کے ماتحت ہے اور اپنی ڈگریاں بھی پنجاب یونیورسٹی کے نام سے لیتا ہے۔ اس لئے یہ دونوں برابر نہیں۔ کالج یونیورسٹی کا کئی لحاظ سے ضمنی ادارہ ہے اور نسبتاً جغرافیائی حدود میں مقید ہے۔ لیکن ہمارے دوست نمک حلالی کے طور پر یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ گو یہ بحث اپنے نتیجہ میں بے مقصد تھی لیکن کسی صورت ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اچانک میری نظر حضرت قاضی صاحب پر پڑی جو اُس وقت جلسہ سالانہ کی صدارت کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اس جلسہ کے بعد اس بحث کا خاتمہ کروادوں گا۔ فرمانے لگے وہ کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ جلسہ کی صدارت جو صاحب کر رہے ہیں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں ان سے زیادہ موزوں منصف نہ مل سکے گا۔ جبکہ وہ خود بھی اسی مقام پر رہے ہیں جس کی تم تعریف کر رہے ہو۔ جلسہ کے اختتام پر ہم سب قاضی صاحب کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ جم غفیر کے جانے کے بعد ہلکی گرد میں سے حضرت قاضی صاحب اکیلے ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرے دوست یہ بات ماننے پر تیار نہ ہوئے کہ یہ وہی شخص ہیں جو آدھ گھنٹہ پہلے اتنے بڑے جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے اور اب اکیلے پیدل چلے آتے ہیں۔ پہلے تو یہ مسئلہ حل کیا اور پھر قاضی صاحب سے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ ہی صدارت فرما رہے تھے اور پھر یہ کہ کیا آپ بھی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ جب جواب اثبات میں ملا تو حیرانگی اور بڑھی۔ اس پر میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ جماعت احمدیہ شخصیت پرستی نہیں کرتی اور احمدیت نے کئی لحاظ سے چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا کر کے ایک ایسا معیار مقرر کر دیا ہے جس میں فرق زیادہ نہیں۔ اِن باتوں کے بعد میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ایک مسئلہ زیر بحث ہے جس کو صرف آپ ہی سلجھا سکتے ہیں۔ جب قصہ بیان کیا تو آپ کی گورنمنٹ کالج کی وابستگی کی یاد دوبارہ اچانک ہری ہوگئی۔ فرمانے لگے کہ بھئی گورنمنٹ کالج کی تو بات ہی اور ہے۔ اس پر میرے دوست بہت خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ سوال یہ بھی ہے کہ آیا گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا عہدہ پیش کیا جائے تو کیا وہ اُسے قبول کرے گا؟ کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ ”وقت وقت کی بات ہے۔ آج کل تو کسی جگہ عزت نہیں۔ پھر کہا بھئی سچی بات ہے اگر میرے وقت میں مجھے ایسی پیش کش کی جاتی تو میں تو قبول کر ہی لیتا لیکن ایسا موقعہ ہی نہ آیا۔ اس جواب سے میری تسلی بھی کروادی۔ پھر فرمانے لگے کہ کیا پروگرام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی خاص نہیں تو کہنے لگے چلو پھر میرے ساتھ گھر تک چلو، چل کر باتیں کرتے ہیں۔ قاضی صاحب چونکہ چوہدری محمد علی صاحب کی کوٹھی پر ٹھہرے تھے، اس لئے وہاں چلے گئے۔ راستہ میں چلتے ہوئے چوہدری صاحب بھی سائیکل پر جاتے ہوئے ہم سے آن ملے پھر یہ قافلہ آہستہ آہستہ چوہدری صاحب کی کوٹھی پر پہنچا جہاں دھیمی روشنیوں میں دو فلاسفروں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ قادیان کے زمانہ کی، تقسیم ہند کے دور کی، تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی، فلسفہ اور نفسیات کی اور کبھی علی گڑھ یونیورسٹی کے احوال کی۔

آج قاضی صاحب مرحوم ہم میں نہیں ان کی یادیں باقی ہیں۔ ہزاروں زندگیوں پر ان کی ذات نے اثر ڈالا۔ اگر ہم سب طالب علم اپنی اپنی یادداشت سے چند واقعات اکٹھے کر سکیں تو حضرت قاضی صاحب کی زندگی اور شخصیت اور دینی و دنیوی خدمات پر ایک مربوط کتاب بن جائے اور یہ ایک عمدہ شکرانہ ہو گا ان کی ان عظیم خدمات کے بدلہ میں جو انہوں نے اپنی ساری زندگی میں بطور مدرس انجام دیں۔

(ہفت روزہ بدر قادیان جلسہ سالانہ نمبر۔ 26-19 دسمبر 1985 صفحہ (29-27)

اے ٹی آئی کالج.....!

چٹانوں کے دامن کی اجلی فضاء میں یہ ٹی۔ آئی کالج کی رنگیں عمارت
حقیقی تعلّم کی وہ درسگاہ ہے بصد شوق کی جس کی مَیں نے عبادت
اسی کی محبت بھری گود سے فیضیاب ہوکے نکلے ہیں دیں کے سپاہی
یہی ہے وہ منزل جسے دیکھتا ہے نگاہِ تعجب سے ہر ایک راہی
تیرے فیض سے ہی اَے ٹی آئی کالج! انہیں مل چکی ہے رہِ استقامت
جنہیں سالہا سال سے نہ پتہ تھا کہ ہے زندگانی میں مضمر حلاوت
جہاں کی بیابانیوں میں عیاں تھی نہ عالم فروزی نہ خورشید گیری
وہاں سے میسر ہوئی ہے ہزاروں بھٹکتے جوانوں کو روشن ضمیری

بادی مونس۔ بی ایڈ (اولڈ بوائے ٹی آئی کالج)

اب ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر

از قلم: ڈاکٹر عمران احمد خان۔ آٹوا

جن گھروں میں اپنے بزرگوں کی قربانیوں کے تذکرے زندہ ہیں وہ اپنے بزرگان کی ماند عہد وفا کو نبھانے کی توفیق بھی پا رہے ہیں الحمد للہ- خدا کرے کہ آئندہ نسلیں بھی اپنے بزرگوں کی ایمانوں کو جلا بخشنے والی تاریخ کو ہمیشہ دھراتی چلی جائیں۔

اپنے ان نافع الناس خادمین انسانیت کا خیال آتے ہی دل میں یہ تحریک اٹھی کہ اپنے تعلیم الاسلام ہائی سکول دور کے ایک ٹیچر استاذی المکرم ماسٹر عبدالسمیع خان صاحب (سابق ہیڈ ماسٹر) کی خدمات کے خصوصی تذکرہ کیساتھ اس داستاں کو کیوں نہ سجایا اور مہکایا جائے۔

اگر یہ ادارے فقط سنگ وخشت کا ہی نام ہوتا تو ہم بہت تہی دست تھے کہ ہم نے کچے کمروں اور ٹاٹ والے سکولوں سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہمیں شروع سے ہی ازحد محنتی، بلند کردار اور بے لوث اساتذہ کرام میسر آئے۔ جو ان اداروں کے روح رواں اور اپنی خداداد تعلیمی استعداوں سے مالا مال تھے۔

انہی محترم و قابل صد احترام اساتذہ کرام میں سے ایک محترم ماسٹر عبدالسمیع خان صاحب (سابق ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ) کی ذات باجود بھی تھی- جن کے متعلق یہ بات بلا تردود کہی جا سکتی ہے کہ لاریب وہ ایک آئیڈیل ٹیچر تھے-

ہمیں نویں، دسویں میں ماسٹر صاحب نے ریاضی (Math) کا مضمون پڑھایا۔ انداز سادہ مگر نہایت ہی متاثر کن ہوا کرتا تھا۔ جب تک طلباء کو سبق ازبر نہ ہو جاتا، آگے نہیں چلتے تھے۔ تضیع اوقات سے اس قدر بیزار تھے کہ کلاس روم میں آتے ہی بلیک بورڈ کی طرف چاک لیکر ریاضی کی باریکیوں کو اس طرح کھول کر بیان کر دیتے کہ گویا یہ بھی میرے دل تھی، والا معاملہ تھا۔۔۔۔!

پیریڈ ختم ہونے پر کھڑے پاوں واپس لوٹ جاتے۔ استاد کی کرسی ان کیلئے فالتو اور ایک بیکار محض کی حیثیت رکھتی تھی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ریاضی پڑھانے والے قدرے خشک طبیعت کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر خان صاحب میں ڈانٹ ڈپٹ یا غصہ ان کے مزاج کا حصہ ہی نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کلاس میں مکمل خاموشی ہوا کرتی تھی۔

شفیق اتنے کہ جب علامتا کسی کو سزا دینی پڑ جائے تو ایک چھوٹے سائز کی سوٹی (عرف "مولا بخش") اتنا قریب لا کر ہاتھ پر مارتے کہ تکلیف کا ذرا بھر احساس نہ ہوتا۔ ورنہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ

جب استاد مارا کرتے تھے تو "کوہ"
کے رکھ دیا کرتے تھے۔۔۔۔!

پدرانہ شفقت اور اپنے شاگردوں کیساتھ تعلق کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی کہ جب کوئی پرانا شاگرد راستے میں مل جاتا تو اس کے میٹرک کرنے کا سال ازخود بتا دیا کرتے۔۔۔۔ ع

اب ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر

۱۹۷۲ء میں تعلیمی اداروں کے نیشنلائزڈ ہونے پر محترم ملک حبیب الرحمان صاحب کی جگہ آپ کو ہیڈ ماسٹر مقرر کیا گیا۔ اسی سال ہمارا سکول بھی دیگر تعلیمی اداروں کی طرح نیشنلائزڈ کرنے کی بھٹو حکومت کی پالیسیوں کی نذد ہو گیا۔ آپ ۱۹۷۷ء تک تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات رہے۔ پھر آپ کا تبادلہ دور دراز علاقوں میں ہوتا رہا۔ ۱۹۹۹ء میں آپ ریٹائرڈ ہوئے۔ لیکن تدریس کا سلسلہ تادم آخر کسی نہ کسی رنگ میں جاری رہا۔ گویا۔۔۔۔۔۔ ع

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شمع علم نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں شاگردوں کو جہاں تعلیم کی روشنی سے منور کیا، وہیں اپنے عمل کے نیک نمونے سے ان کی کردار سازی کا فرض بھی کماحقہ نبھایا، جو لاریب صدقہء جاریہ کا رنگ رکھتا ہے۔

مادہ پرستی کے اس عہد بے ظرف میں آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں کے

اس شمع علم نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں شاگردوں کو جہاں تعلیم کی روشنی سے منور کیا، وہیں اپنے عمل کے نیک نمونے سے ان کی کردار سازی کا فرض بھی کماحقہ نبھایا، جو لاریب صدقہء جاریہ کا رنگ رکھتا ہے۔

مادہ پرستی کے اس عہد بے ظرف میں آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں کے اساتذہ کرام اپنے اسلاف کے نقش قدم پر اپنی جماعتی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین

خدائے بزرگ و برتر کے حضور صمیم قلب کیساتھ دعا ہے کہ وہ ہمارے اس ہیڈ ماسٹر و دوسرے مرحوم اساتذہ کرام کو جنت الفردوس میں علی العالین مقام عطا کرے (آمین) جو صحرا کی فضاؤں میں گل و گلزار اور شب کی تاریکیوں میں چراغ راہ کی مانند روشنیوں کے امین تھے۔ اللہ تعالی ان کے پسماندگان کا بھی ازخود حامی و ناصر ہو۔ لاریب ۔۔۔۔۔۔ ع

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آیا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

ہر احمدی سوشل میڈیا کی غلاظتوں سے

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:۔

آج سفروں کی سہولتیں، ٹی وی، انٹرنیٹ اور متفرق میڈیا نے ہر فردی اور مقامی برائی کو بین الاقوامی برائی بنا دیا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ ہزاروں میلوں کے فاصلے پر رابطے کر کے بے حیائیاں اور برائیاں پھیلائی جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کو ورغلا کر اُن کی عملی حالتوں کی کمزوری تو ایک طرف رہی، دین سے بھی دور ہٹا دیا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں میرے علم میں ایک بات آئی کہ پاکستان میں اور بعض ملکوں میں، وہاں کی یہ خبریں ہیں کہ لڑکیوں کو شادیوں کا جھانسہ دے کر پھر بالکل بازاری بنا دیا جاتا ہے۔ وقتی طور پر شادیاں کی جاتی ہیں پھر طوائف بن جاتی ہیں اور یہ گروہ بین الاقوامی ہیں جو یہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ خوفناک حالت رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ اسی طرح نوجوان لڑکوں کو مختلف طریقوں سے نہ صرف عملی بلکہ اعتقادی طور پر بھی بالکل مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ پس جہاں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہر احمدی کو ان غلاظتوں سے محفوظ رکھے، وہاں ہر احمدی کو بھی اللہ تعالی سے مدد چاہتے ہوئے ان غلاظتوں سے بچنے کے لئے ایک جہاد کی ضرورت ہے۔ زمانے کی ایجادات اور سہولتوں سے فائدہ اُٹھانا منع نہیں ہے لیکن ایک احمدی کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس نے زمانے کی سہولتوں سے فائدہ اُٹھا کر تکمیل اشاعت ہدایت میں حضرت مسیح موعود کا مددگار بننا ہے نہ کہ بے حیائی، بے دینی اور بے اعتقادی کے زیر اثر آ کر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کرنا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ مورخہ 6 دسمبر 2013 .)

نگار صبح

عبید اللہ علیم (مرحوم)

نگار صبح کی اُمید میں پگھلتے ہوئے
چراغ خود کو نہیں دیکھتا ہے جلتے ہوئے
وہ حسن اس کا بیاں کیا کرے جو دیکھتا ہو
ہر اک ادا سے کئی قد نئے نکلتے ہوئے
وہ موج میکدہ رنگ ہے بدن اس کا
کہ ہیں تلاطم مئے سے سبو اچھلتے ہوئے
تو ذرّہ ذرّہ اس عالم کا ہے زلیخا صفت
چلے جو دشت بلا میں کوئی سنبھلتے ہوئے
یہ روح کھینچتی چلی جارہی ہے کس کی طرف
یہ پاؤں کیوں نہیں تھکتے ہمارے چلتے ہوئے
اُسی کے نام کی خوشبو سے سانس چلتی رہے
اُسی کا نام زباں پہ ہو دم نکلتے ہوئے
خیال و خواب کے کیا کیا نہ سلسلے نکلے
چراغ جلتے ہوئے آفتاب ڈھلنے کے
اندھیرے ہیں یہاں سورج کے نام پر روشن
اجالوں سے یہاں دیکھے ہی ہوں جلتے ہوئے
اُتار ان میں کوئی اپنی روشنی یاربّ
کہ لوگ تھک گئے ظلمت سے اللہ بہلتے ہوئے
وہ آرہے ہیں زمانے کہ تم بھی دیکھو گے
خدا کے ہاتھ سے انسان کو بدلتے ہوئے
وہ صبح ہوگی تو فرعون پھر نہ گزریں گے
دلوں کو روندتے انسان کو مسلتے ہوئے

بذلہ سنجی اور حُسنِ بیان

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دورِ طالبعلمی میں گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین «راوی» کیلئے ایک مضمون تحریر کر کے رسالے کے ایڈیٹر بذل حق محمود کو بغرض اشاعت دیا تھا۔ مگر وہ مضمون ایڈیٹر صاحب سے گم ہوگیا۔ حضور رحمہ اللہ نے اس صورتِ حال کو جس کمال خوبصورتی کے ساتھ شعروں کے پیرائے میں بیان فرمایا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

بذل حق محمود سے میری کہانی کھو گئی
بذل حق سے روٹھ کر وہ واصل حق ہوگئی
نذر» راوی» کی تھی میں نے کتنے ارمانوں کیساتھ
ناؤ لیکن کاغذی تھی غرق راوی ہو گئی

ربوہ کے یادگار دن

کتنے حسین دن تھے ربوہ میں جو گزارے
ربوہ میں دیکھے میں نے مولا کے خاص پیارے
توفیق خدمتوں کی ملتی رہی یہاں پر
پیاروں کے سایہ میں ہی مومنؔ نے دن گزارے

(خواجہ عبدالمومن۔ ناروے)

وطن نوردی

ہشام قمر ملک۔ ایڈمنٹن

مُدتوں بہت سے اجنبی دیاروں کی خاک چھاننے اور پھانکنے کے بعد ایک بار پھر وطن وارد ہوا تو ایک بے نام سی طمانیت اور اپنائیت کا احساس وجود میں سرایت کر گیا۔ یوں جیسے لق و دق صحراؤں میں چلتے چلتے کسی مسافر کو یک بہ یک سایہ میسر آ جائے۔ یا جیسے دِن بھر کا تھکا ہارا بچہ ماں کی آسودہ آغوش میں آ کر بے فکر سا ہو جائے۔!

دریائے چناب کے کنارے خُشک پہاڑیوں کے دامن میں آباد دیار وطن ہمارے لئے کسی حسین پُرسکون جنت مقام سے کم نہیں۔ یہاں کی خاک کے ذرے ذرے سے وابستہ بہت سی یادیں، رنگین لمحوں کی داستانیں، کئی انوکھے اور دلچسپ لوگوں کی باتیں، یہی اپنی متاع کُل ہیں۔ ہر بار جب وصل کے لمحات آتے ہیں تو ہجر کے پُر درد قصے چھیڑنے کی بجائے ہم کتابِ ماضی کھول کر خوابیدہ یادوں کی جگالی کرتے ہوئے گزرے دِنوں کی بازگشت سنا کرتے ہیں۔ چُنانچہ اب کے بھی وصل کی اُن چند گھڑیوں میں قلب کی وارداتوں کا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔

شہر کے اُس طرف ریلوے لائن کے پہلو میں یہ خستہ حال عمارت ٹی آئی کالج کہلاتی ہے۔ آج جو یہ حال سے بے حال نظر آتی ہے پہلے ایسی نہ بھی بلکہ رونقیں اور عظمتیں اس مقام کے ہر ایک گوشہ سے پھوٹ پھوٹ پڑتی تھیں۔ یہ راہ داریاں، یہ برآمدے، یہ لیکچر رومزوہ تھے جہاں علم و دانش کے بلند قامت پہاڑ رونق افروز رہتے ۔علم و اخلاق کے انوار بارش کی مانند برسا کرتے۔ مگر آج حال کی ستم ظریفیوں پر یہ ادارہ سرنگوں نوحہ کناں سا دکھائی دیتا ہے۔

چشمِ تصور نے اِس عظیم ادارہ کے روشن دور کے کئی مناظر کو اپنے رُوبرو گزرتے محسوس کیا۔ عجیب دور تھا۔ کالج کے غربی حصہ میں واقع وسیع ہال میں اُستاذی المکرم پروازی صاحب سٹیج پر ڈائس کے عقب میں رونق افروز خطاب کے رنگ میں اُردو ادب کی کَل پُرزوں پر درس دیا کرتے اور اپنے حسنِ بیان سے ایک سماں باندھے رکھتے۔ غالب و میر اور نجانے کون کونسے شعراء حضرات کے پُرزے سر ہال اُڑا کرتے اور خُوب تماشا رہتا۔ اب کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ وہ یقیناً علم و حکمت کے موتی ہی ہوا کرتے ہوں گے۔ چنانچہ اسی لئے ہم جیسے کئی شاگردوں کی بالائی منزل سے بالا ہی بالا پرواز کر جاتے اور دیر تک کان عجیب سی آوازوں سے بجتے محسوس ہوتے رہتے۔ ہم نے بارہا لیکچر کے بعد اپنے عزیز دوست انیس خان کو غیر ملکی طلباء کے ہمراہ نوٹس تیار کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اس مصرعہ «وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے» کی وضاحت اور تشریح اِن الفاظ میں کرتے سُنا کہ

» Otherwise what respect Mr. Ghalib has in the city.«

ڈسپلن کی پابندی نہایت سختی سے کرائی جاتی۔ دوران لیکچر معمولی سی آواز بھی قابل تعزیر قرار پاتی۔ کبھی اگر ایسا ہوا کہ کسی نکتہ کے بیان میں ہم نے بھی اپنی رائے (جو کہ آنمحترم کے نزدیک ہمیشہ ناقص متصور ہوتی رہی ہے) پیش کرنے کی جسارت کی تو جواباً نہایت احترام سے کلاس بدر کر دئے گئے۔ اور ایسا تو بارہا ہوا کہ صبح کے وقت نیشنل کیڈٹ کور کی چُست فوجی وردی زیب تن کئے بھاری بھر کم بوٹ بجاتے خراماں خراماں ، محض چند ہی منٹ دیر سے لیکچر ہال میں داخل ہوئے اور نشست پر پہنچنے سے قبل ہی شہادت کی انگلی کے اشارے سے انہی قدموں پر باب خروج کی راہ دکھا دئے گئے۔

ایسے میں بابا شادی خوب کام آتا۔ ایسی بے تکلف اور بے باک ہجو کرتا کہ تمام حساب بے باق کر دیتا اور طبیعتوں میں

ٹھنڈ سی پڑ جاتی۔ کالج سے وابستہ احباب بابا شادی کی دلچسپ اور پُر بہار شخصیت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ارباب اختیار کا چہیتا اور مونہہ چڑھا تھا۔ دُبلا پتلا مُنحنی سا وجود، سفید ریش، چھوٹے سے ناک پر رکھی گول شیشوں کی عینک - پُورے چہرہ پر شریر سا تبسم ہمیشہ غالب -مختصر سے تہبند اور کُرتے بلکہ اکثر بنیان میں ہی ملبوس -تمام دن کالج کے برآمدوں اور راہ داریوں میں بابا شادی کے چُست فقرے اور پھبتیاں گونجا کرتیں۔ ہمارے ساتھی گواہ ہیں کہ ہم نے بڑے بڑے جغادری اساتذہ کرام کو بابا شادی کے بے تکلف آوازوں اور پھبتیوں کے سامنے چپ چاپ سرنگوں گزرتے دیکھا ہے۔

اُنہی دنوں کالج ہال کے غربی کونے میں آمنے سامنے کے دو کمرے محترم پروازی صاحب اور استاد محترم عبدالرشید غنی انبالوی صاحب کو بطور دفتر الاٹ ہوئے تھے۔ ہمارا اُدھر سے گزر ہوا تو دونوں بزرگ اپنے اپنے کمرے ترتیب دے رہے تھے۔ بالکل بے ارادہ مونہہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ؛

«خُوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو»

دونوں کھلکھلا کر ہنس دئے اور بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ہم وطن بدر ہو گئے تھے۔ لہٰذا کیسی گزری، اللہ تعالیٰ کے بعد وہ دونوں حضرات ہی بہتر جانتے ہوں گے۔

کالج کے پہلو میں واقع ہائی سکول کے ادارے کی اپنی علیحدہ یادیں ہیں جو اکثر عمر رفتہ کو آواز دیتی رہتی ہیں۔ یہاں سے بھی صبح و مسا علم اور اخلاق کے درس جاری ہوتے اور خام ذہن علم کے نور سے منور کئے جاتے۔ اِنہی چھتوں کے سائے میں بیٹھے ہم اپنے معصوم ذہنوں میں نہایت شفیق اساتذہ کے ہاتھوں میں لہراتے پھنکارتے سفاک «مولا بخش» سے رب عرشِ عظیم کی پناہ طلب کیا کرتے تھے۔

کڑکتی دوپہروں میں اکثر کسی خالی پیریڈ میں کلاس روم کے وسط میں پنکھے کے عین نیچے والی نشست پر قبضہ جمائے خان انیس خان اپنے گرد ہجوم کئے ڈیسک کو بطور ڈھولک بجاتے ہوئے بے سُری آواز میں جگنی سنایا کرتے اور نتیجتاً کلاس مانیٹرز ناصر وینس یا عمران خان کے ہاتھوں امنِ عامہ میں خلل انداز ہونے کے الزام میں سرفہرست نام لکھوا کر اپنے منطقی انجام کو پہنچتے اور پھر کئی دن تک کپڑے میں لپٹی گرم اینٹ کی ٹکور خُود بھی کرتے اور ہمیں بھی کرواتے۔ موصوف جو ہمارے دوستوں میں سے ہیں سینئر طلباء میں سے تھے۔ سینئر یوں کہ ایک دور میں ہم سے دو کلاسیں آگے ہُوا کرتے تھے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ ہم سے دو کلاسیں پیچھے رہ گئے۔ مگر یاری میں کلاس کو کون دیکھتا ہے، چنانچہ ہماری دوستی پھر بھی قائم رہی۔ سرسیّد کا قول مشہور ہے کہ یار کی یاری سے کام۔ اُس کے فعلوں سے کیا سے کیا کام۔!(failures) سے کیا کام۔ ہم کہتے ہیں یار کی یاری سے کام اُس کی

گول بازار کے قریب خلافت لائبریری کے سامنے سکول کے زمانہ کے ایک نہایت محترم استاد سائیکل پر جاتے جاتے کم و بیش چھلانگ لگاتے ہوئے رُکے اور دُور سے ہی اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ارے بھئی مجیب صاحب (ہمارے بڑے بھائی)، کیا حال ہے آپ کا۔ بڑی خوشی ہوتی ہے اپنے لائق اور قابل شاگردوں سے مل کر۔ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟ ارے اچھا۔ مجیب نہیں تو کیا اطہر ہو؟ بھئی بہت بڑے ہو گئے ہو۔ کیا کرتے ہو آج کل؟

ہم نے محفوظ فاصلہ درمیان میں برقرار رکھتے ہوئے عرض کی۔ ماسٹر صاحب! آپ نے تو پنجابی مثل «کٹی نہ ہوئی۔ کٹا تو ہو گا ہی» کا عملی نمونہ پیش فرما دیا ہے۔ اب تو محض «کٹا» ہی بچا ہے، سو وہ حاضر خدمت ہے۔!

«مولا بخش» کی یاد میں ڈوبتے ہوئے بولے۔ اچھا۔ تو تم وہ ہو جو کلاس میں سب سے زیادہ مار کھایا کرتے تھے اور اُردو شعر کو پڑھتے ہوئے نثر بنا دیتے تھے۔ پھر نظریں ہمارے کانوں پر ٹکا کر کہنے لگے۔ بھئی ماشاء اللہ بہت بڑھے پھُولے ہو۔ چکر کیا ہے؟ ہم نے عرض کی۔ جناب کچھ تو موروثی تھے۔ اس پر استاد بھی نہایت مہربان تھے۔ اب دیکھ لیں جگ کے ہینڈل سے کم کیا ہوں گے؟

مشتاق احمد یوسفی اپنے حلیہ کے بیان میں ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ؛

«ناک میں بذاتہ کوئی نقص نہیں ہے۔ تاہم بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرہ پر نصب ہے»۔

ہمارے کانوں کا المیہ بھی اس کے سوا اور نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جب اپنے اجداد کے مسکن واقع وادی سُون و سکیر جانے کا اتفاق ہوا تو بہت سے ہم قوم اعوان ہیئت اور ساخت کے اعتبار سے اپنے ہی «ہم کان» نظر آئے اور کوئی ایک نظر بھی بطور خاص کانوں پر ٹکتی محسوس نہ ہوئی۔ تب اجنبیت اور تنہائی کا جان لیوا احساس یکا یک جاتا رہا اور طبیعت میں ایک بشاشت اور شگفتگی سی سرایت کر گئی۔

دیارِ وطن میں کچھ مقام اور قیام گاہیں وہ ہیں جہاں ہمارے ننھیال کے بزرگوں اور عزیزوں کے بسیرے تھے۔ یہیں ماموں صاحبان و دیگر بزرگان و عزیزان کے مابین رنگارنگ مجالس منعقد ہوتیں اور چھوٹوں بڑوں کا ایک مجمع سا لگا رہتا۔ بزرگ اور قدرے بڑی عمر کے عزیز سنجیدہ صورت بنائے دنیا بھر کے موضوعات کھنگال ڈالتے۔ فلسفہ، تاریخ، سیاست، ادبیات اور مذہبیات جیسے موضوعات روز ان کا تختۂ مشق بنتے اور گرما گرم مباحثوں کے اکھاڑے میں تابڑ توڑ دلائل کی باکسنگ سے لہو لہان کر دئے جاتے اور جب خدشہ بڑھنے لگتا کہ موضوع سخن منازل مندرجہ بالا سے اُتر کر «ذاتیات» پر نہ آجائے تو مجلس کو برخواست کرنے کے مناسب جواز کے طور پر بے سُری تانوں کا دور چلتا۔ اِس میدان میں اپنا خاندان ہماری ہوش سے بھی بہت پہلے سے خُود کفیل ہے اور ایک عرصہ دراز سے مبتلائے خوش فہمی ہے۔ چنانچہ ایسا ہوتا کہ ہر کس

و ناکس بے ہنگم تانوں بلکہ چیخوں میں ایک دُوسرے کو مات کرتا جاتا اور ہر ایک بے ہنگم چیخ کے بعد حوصلہ افزائی کو آڑ بنا کر بے جا داد و تحسین کے ڈونگرے پیٹے جاتے۔ حد اُس وقت ہوتی جب بڑے ماموں کمال سنجیدگی سے تبصرہ فرماتے۔ بھئی واہ۔ آواز نے غزل میں جان ڈال دی ہے۔

تب یکا یک ماحول پر ایک افسردگی سی چھا جاتی اور فضاؤں میں اور ہواؤں میں دیر تک غالبِ خستہ کی سسکیاں صاف سنائی دیتی رہتیں اور چند ہی منٹوں میں مجمع تر بتر ہو جاتا۔!

بشیر بھائی کے ذکر کے بغیر رُوداد وطن ادھوری سی محسوس ہوتی ہے۔ نہایت مرنجان مرنج اور باغ و بہار قسم کی شخصیت رکھتے تھے۔ موصوف اُس وقت ایک کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے جس کے باعث ہر چھوٹی بڑی بات کی مین میخ اور عرق نکالنا اُن کا محبوب مشغلہ رہتا۔ اُن دنوں بکری کے دُودھ کے فیوض و برکات اُن کا خاص موضوع سُخن تھا۔ کھانسی اور نزلہ سے لے کر جوڑوں کے درد، امراض جگر، پھیپھڑے، دل، معدہ گردے، تلی و دیگر امراض ظاہری و باطنی کے علاج کی ساری ذمہ داری وہ بکری کے دودھ پر ڈالتے تھے۔ حتیٰ کہ اخلاق کی درستی اور مدارج روحانی و مراتب سلوک کے حصول کے لئے بھی بکری کے دودھ کو جزوِ لازم قرار دے رہے تھے۔ غرضیکہ تمام کائینات کے فلسفہ کا نچوڑ اور خُلاصہ اُن دنوں بکری کا دودھ تھا۔ بے چارہ بکری کا دودھ!

ایک دن ترنگ میں اگر فرمانے لگے دُودھ نہ بھی ہوتا، تب بھی بکریوں کی تمام تر نسل ہم مسلمانوں کو نہایت محبوب اور عزیز از جان بلکہ عزیز از معدہ رہتی۔ چنانچہ ہم میں سے بعض کا حوصلہ اور ظرف دیکھئے کہ اپنی ایک سالم کی سالم عید کو اس نسل سے موسوم کر رکھا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس اعزاز و اکرام کی اِس قوم کو بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یعنی ایک ہی دن میں کشت و خون کا وہ سماں بندھتا ہے کہ بکروں کو اپنی نانی یاد آجاتی ہے۔ موصوفہ (یعنی نانی) کو خود بھی اِسی راہ میں لقمۂ مومنین بنے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہوتا۔ دراصل ہم مومنین بیچارے بھی مجبور ہیں۔ صدہا سال کی عادت ایسے ویسے کہاں چھوٹتی ہے۔ اور اب تو یہ عالم ہو چکا ہے کہ دو ایک روز بکرا دستر خوان پر بصورتِ ذبیحہ نظر نہ آئے تو معدہ سرد آہیں بھرنے لگتا ہے اور انتڑیوں سے میں میں کی صدائیں ہڑ بڑا کر ہمیں نیند سے اُٹھا دیتی ہیں۔ عجیب بات ہے، کسی کی جان گئی اور اِدھر انسانی نظام انہضام کی ادا ٹھہری۔!

الغرض اُن چند دنوں کی صحبت نے بکری کے لحم و لبن کا تمام تر فلسفہ ہمیں از بر کرا دیا۔ جہاں تک کائنات کے دیگر فلسفوں کا تعلق ہے، کہنے لگے۔ گزشتہ چھ سالوں میں اِس ڈیپارٹمنٹ میں صرف ایک سٹوڈنٹ آیا تھا۔ اُس نے بھی مجھ پر اور پرنسپل پر مقدمہ دائر کر دیا، جسے عدالت نے نامعقول قرار دے کر خارج کر دیا۔ بڑی اچھی نوکری ہے۔ مہینہ میں صرف ایک دن کام اور باقی دن عیش اور موج میلہ۔ کام کا دن مہینہ کی آخری تاریخ ہوتا ہے جب چپڑاسی کو دفتر بھیج کر تنخواہ کا چیک منگوانا ہوتا ہے۔ اللہ اللہ اور خیر سلّا۔!

چند چھٹانک یومیہ گندم کی تلاش ایک بار پھر مجھے بے وطن کر گئی ہے۔ خاک وطن کی مہک جو وجود کے ہر ذرہ میں رچی بسی ہے اکثر یہ سرگوشی کرتی محسوس ہوتی ہے کہ وقت کا یہ سفر ایک گول چکر کی مانند ہے۔ ایک دن یہ چکر دوبارہ اُسی مقام پر پہنچ کر وصل کے اِن لمحات کو پھر سے جگا دے گا اور ہم مل جائیں گے۔

میں سوچتا ہوں ہاں شائد۔ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہم ایک دن مل جائیں گے۔!

قاتل لوگو!

مسجد و گنبد و محراب کے قاتل لوگو!
اس قدر کیوں ہو خدا پاک سے غافل لوگو؟

بو دیے بیج جو نفرت کے اُگے گی نفرت
اس طرح پیار محبت تو ہے مشکل لوگو

بھر دیا بچوں کی رگ رگ میں تعصب کا جنوں
ہو گا ان نسلوں سے اب زہر ہی حاصل لوگو

ٹوٹے میناروں کو دیکھوں تو یہ دل دُکھتا ہے
صدمہ اتنا ہے کہ برداشت ہے مشکل لوگو

دیکھا جاتا نہیں بکھرا ہوا گھر اللہ کا
عرش ہلتا ہے جو روتا ہے مرا دل لوگو

توڑنا کتبوں کو قبروں کو کہاں جائز ہے
یہ کوئی دین کی خدمت نہیں جاہل لوگو

خیر امت کے یہ انداز نہیں ہوتے ہیں
کام ایسے تو کیا کرتے ہیں بُزدل لوگو

نام اللہ کے نبیؐ پیارے کا، تخریب کے کام
ڈر ہے ہو جاؤ نہ تم قہر کے قابل لوگو

(امۃ الباری ناصر۔ ۱۹)

بڑھاپا۔۔۔!

ڈاکٹر عمران احمد خان - آٹواہ

فضل عمر ہسپتال ربوہ کے سالانہ کنونشن میں ہسپتال کے ایڈٹوریم میں میں پڑھی جانیوالی ایک فکاہیہ نظم۔جس میں چوہدری محمد علی صاحب ایم اے ، مرحوم ومغفور بھی موجود تھے۔سبھی حاضرین بہت محظوظ ہوئے اور دوران نظم ، ہال میں قہقہے بھی گونجتے رہے۔۔۔!

ذہن اب تخلیق سے عاری
خطہ بے آب سا کچھ ہے
یاد ماضی ہوئی دہن کے دانت
اب تو باقی لعاب سا کچھ ہے

دید ، میں موتیا رکاوٹ ہے
وہ تو اب بھی گلاب سا کچھ ہے
ہیرنگ کو بھی اب تو چاہیے ایڈ
آئی ایم ایف کو حجاب سا کچھ ہے

ہر کسی پہ آنا خواب ہوا اور اب
دل کا خانہ خراب سا کچھ ہے
سچ بھی بولوں تو سانس چڑھتا ہے
حافظہ نقش بر آب سا کچھ ہے

نیند اور بھوک ہیں روبہ زوال
ہاضمہ بھی خراب سا کچھ ہے
پراسٹیٹ ڈیم پیچھے بننے سے
آگے راوی ، چناب سا کچھ ہے

اٹھنا ، بیٹھنا گھٹنوں سے محال ہوا
یعنی کورا ، جواب سا کچھ ہے
فکر اپنی کچھ اس طرح بگڑی
نقشہ « باب الابواب » سا کچھ ہے

مسائل گننا بھی اب تو مسئلہ ہے
معاملہ بے حساب سا کچھ ہے
اب ملیں گے سڑک کے اس پار
یہی اب ، لب لباب سا کچھ ہے

بے حال کر دیا مجھے ماضی کی یاد نے!

نثار باجوہ

دیوار و در دیکھ کے رویا ہوں آج میں
اور ماں کے گھر کو دیکھ کے رویا ہوں آج میں
آنکھوں کے سامنے ہے ماں باپ کا یہ گھر
یہ بار بار دیکھ کے رویا ہوں آج میں
جس کے مکیں رہے نہ وہ خود مکاں رہا
وہ خستہ حال دیکھ کے رویا ہوں آج میں
وہ سہانی سی شامیں اور اسکے بھلے سے لوگ
ان چہروں کو نہ دیکھ کے رویا ہوں آج میں
بے حال کر دیا مجھے ماضی کی یاد نے
پژمردہ رت کو دیکھ کے رویا ہوں آج میں
خوشبو سمٹ کے آئی تو یادیں ہوئی جواں
اپنے نگر کو دیکھ کے رویا ہوں آج میں
قدموں کی چاپ سن کے یہاں بیٹھ جا نثار
اس خاک پا کو دیکھ کے رویا ہوں آج میں

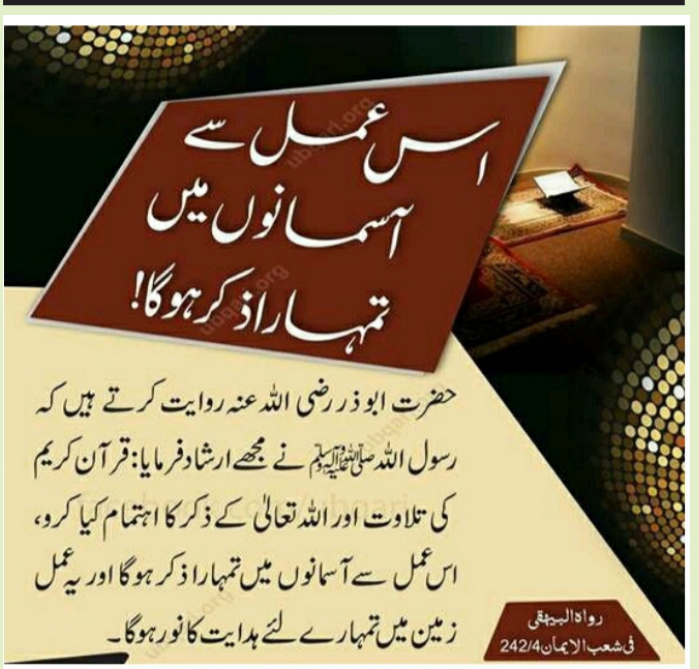

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر (ربوہ) کی نئی عمارت کے چند مناظر

Abdul Mannan, Prof. Dr. Naseer Ahmad Khan, Mian Afzal Hussain, Sufi Basharat-ur-Rehman
Inauguration of New Campus TIC, Rabwah
SEP, 1970

Prof. Dr. Naseer Ahmad Khan, Chaudhry Muhammad Ali & Col. Mirza Daud Ahmad
TIC, Rabwah
1965-66

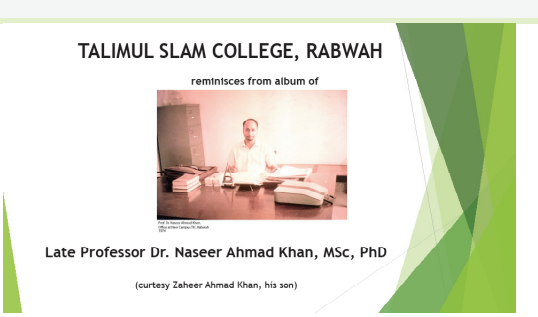

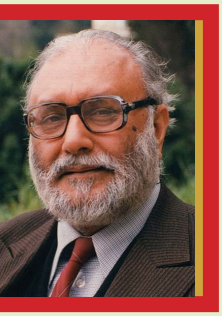

ڈاکٹر عبد السلام صاحب کا ایک مختصر خطاب
نوجوانوں کیلئے ایک پیغام

مرسلہ: مکرم لطیف احمد صاحب کاہلوں

یہ ۱۹۷۱ء کے زمانہ کی بات ہے۔ ساہیوال میں محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے برادر نسبتی مکرم چوہدری نور الدین صاحب جہانگیر وفات پا گئے۔ تو آپ اپنے اس عزیز کی تعزیت کیلئے ساہیوال تشریف لے گئے۔ خاکسار بطور مربی ان دنوں وہاں مقیم تھا۔ جناب ڈاکٹر صاحب مغرب کی نماز کیلئے «بیت مبارک» ساہیوال میں تشریف لائے تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کی کہ آپ احباب جماعت سے کچھ خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بغیر تردد کے حامی بھر لی چنانچہ نماز کے فوراً بعد آپ نے ایک نہایت مختصری تقریر کی مگر آپ اپنے اس چھوٹے سے خطاب میں بہت بڑا پیغام دے، میں بڑا گئے۔ آپ نے فرمایا۔ دنیا کی دوڑ میں اپنے آپ کو منوانے کیلئے سب سے زیادہ کارگر اور کامیاب ہتھیار علم ہے۔ اگر آپ دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں تو علم کے میدان میں اپنا لوہا منوانا ہوگا اور پھر ساتھ ہی یہودیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ مٹھی بھر یہودی اپنی علمی برتری کی وجہ سے تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور بڑی بڑی حکومتیں بھی ان کی مرہون منت ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر آپ جائزہ لیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس وقت دنیا کا بہترین ڈاکٹر یہودی ہے۔ بہترین سائنسدان یہودی ہے۔ بہترین تاجر یہودی ہے غرضیکہ علم کے بل بوتے پر یہودی دنیا کے ہر میدان میں چھائے ہوئے ہیں۔ پس اگر ہم دنیا میں کوئی انقلاب لانا

چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کے محاذ پر مورچہ بند ہو جانا چاہئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے یہودی قوم کے علمی جنون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہودی ماؤں کو علم سے اس قدر عشق ہے کہ وہ طافمورد جو ان کی روایات کی کتاب ہے کا وہ حصہ جو علم کی اہمیت سے متعلق ہے اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی حفظ کروا دیتی ہیں۔ آپ نے یہودی ہیں کی علم سے لگن اور دیوانگی کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ علم کی محبت ان کے ذہنوں پر اس طرح حاوی ہے کہ اگر کسی یہودی ماں کا جوان بیٹا پانی میں ڈوب رہا ہو تو اس وقت بھی جب کہ اسے انتہائی مختصر الفاظ میں پکار کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہیں کہتی کہ میرے ڈوبتے ہوئے بیٹے کو بچاؤ بلکہ اس وقت بھی وہ یہی چلائے گی ہائے میرے ڈوبتے ہوئے بی۔ اے بچے کو بچاؤ۔ ہائے میرے ڈوبتے ہوئے ایم۔ اے بچے کو بچاؤ۔ گویا ایسی ہنگامی صورت حال میں بھی اس کے ذہن سے علم کی اہمیت نظر انداز نہیں ہوتی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے اس مختصر سے خطاب میں نہ صرف دنیا کا فاتح بننے کا گر بتایا گیا بلکہ علم کی ترویج کیلئے جو آپ کے ذہن میں ایک جنون تھا اور جس کے لئے وہ تمام عمر نوع انسان اور خاص طور پر پاکستانیوں کیلئے تڑپتے رہے اس کی بھی ایک جھلک تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور کاش کوئی فرد یا قوم اس پیغام پر کان دھرے۔ آمین

شورش کاشمیری کی گواہی جماعت احمدیہ کے حق میں

کسی بھی نبی کی جماعت کی شان نہ صرف عقائد بلکہ اس کے افراد کے اخلاق سے بھی ہوتی ہے، جناب شورش کاشمیری جو کہ مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری اور جماعت احمدیہ کے شدید مخالف تھے ان کی ایک گواہی ذیل میں انہی کی کتاب سے پیش کی جاتی ہے کہ جیل کے دوران ایک احمدی افسر سے وہ کیسے متاثر ہوئے۔

شورش کاشمیری اپنی کتاب "پس دیوار زنداں" میں رقمطراز ہیں:

"میجر حبیب اللہ شاہ کا سلوک بہر حال شریفانہ تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ پکے قادیانی تھے۔ انکی ہمشیرہ میر زا بشیر الدین محمود کے عقد میں تھیں۔ قادیان کے ناظر امور عامہ سیّد زین العابدین ولی اللہ ان کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں یہ کبھی علم تھا کہ میں آل انڈیا مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری ہوں اور احرار قادیانیوں کے حریف ہیں بلکہ دونوں میں انتہائی عداوت ہے۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے اشارۃً بھی اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ انہوں نے اخلاق و شرافت کی انتہا کر دی۔ پہلے دن اپنے دفتر میں اس خوش دلی اور کشادہ قلبی سے ملے گویا مدتوں العمر کے آشنا ہیں۔ انہوں نے مجھے بیماروں میں رکھا اور اچھی سے اچھی دوا و غذا دینا شروع کی۔ نتیجۃً میری صحت کے بال و پر پیدا ہو گئے اور میں چند ہی ہفتوں میں تندرستی کی راہ پر آگیا۔ وہ بڑے جسور 'انتہائی حلیم' بے حد خلیق اور غایت درجہ کے دیانت دار آفیسر تھے۔ ان کے پہلو میں یقیناً ایک انسان کا دل تھا۔ ان کی بہت سی خوبیوں نے انہیں سیاسی قیدیوں میں مقبول و محترم بنا دیا تھا۔" (پس دیوار زنداں، صفحہ 257 تا 258)

جو اک دن ہماری دعاؤں کے بدلے
گھٹا چھا ہی جائے تو پھر کیا کرو گے

(مکرم منصور احمد منصور کنری ضلع میرپور خاص سندھ (پاکستان) نے دوران قید و بند عمر کوٹ جیل میں یہ نظم کہی ہے۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے آپ کے کلام کے تعلق سے فرمایا کہ: "سارا کلام ہی منصوریت کے جذبات سے گوندھا ہوا ہے۔ اسیری نے نکھار پیدا کیا ہے، حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ ماشاء اللہ بہت دردناک کلام ہے")

رضائے الٰہی پہ گردن جھکائے جو ہم مسکرائے تو پھر کیا کرو گے
سر دار بھی گر اناالحق کے نعرے جو ہم نے لگائے تو پھر کیا کرو گے

یہ مانا جلیں گے نشیمن ہمارے چمن پھونک دو گے اجاڑو گے گلشن
مگر اس طرح بھی تعصب کے مارو نہ ہم باز آئے تو پھر کیا کرو گے

تشدد کرو تم ہمیں گالیاں دو ہمیں بدنام کر کے دنیا ہنساؤ
گھٹے اس طرح بھی نہ اے کم نصیبو جو عظمت کے سائے تو پھر کیا کرو گے

کہاں تک کڑی دھوپ سر پہ رہے گی کہاں تک ہمارے بدن داغ ہوں گے
جو اک دن ہماری دعاؤں کے بدلے گھٹا چھا ہی جائے تو پھر کیا کرو گے

اذاں بند کرو گے زباں بند کرو گے مگر دل کی دھڑکن کہاں بند کرو گے
کوئی بند آنکھوں میں اپنے پیاروں کو پہلو میں پائے تو پھر کیا کرو گے

سوئے دار منصور ہنس ہنس کے چلنا روایت ہماری حکایت ہماری
تم اپنی سناؤ جو قدرت کسی دن تمہیں آزمائے تو پھر کیا کرو گے

ہفت روزہ "بدر" قادیان 23 ستمبر 2003ء

Chaudhry Columbus Khan, Mahdi Abad, Germany- 004915788295797